ڈاکٹر حافظ محمد زبیر [1]

روایت تصوف میں تزکیہ نفس کے ذرائع: ایک تجزیاتی مطالعہ

Abstract

Means of Self-Purification in the Mystical (Tasawwuf) Traditions

There are two major opinions prevalent among Muslims about Tasawwuf (mysticism): one that suggests that it is the basic facet of Islām while other implies that it is an alienated Dīn (code of life) parallel to Islām. In this article, numerous mystical ways of attaining purity of the self (nafs) are discussed. Moreover, it entails the impact that the numerous methods employed in the Mystical traditions have on one's self and the role that they play in the purification process. A discussion on mystical means such as Murāqabah (meditation), Simā' (listening to mystical poetry and music), Wajd (ecstasy), Fanā' (evanescence of abhorred characteristics), Baqā' (persistence of praiseworthy characteristics), abstinence from the worldly affairs (asceticism), Mubashshirāt (bearer of glad tidings) , karāmāt (miracles) and mystical literature, cover a significant portion of the article. Similarly, it also includes a discussion on the status of the methods involved, in the eyes of Islamic Law and Salaf (righteous predecessors).

مراقبہ کا ایک تصور سلف صالحین کا ہے اور ایک صوفیاء کا اور دونوں میں کافی فرق ہے۔ امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 751ھ) نے اپنی کتاب "مدارج السالکین" میں ایک فصل "المراقبۃ" کے نام سے قائم کی ہے۔ یہ فصل

[1] اسسٹنٹ پروفیسر، کامسائٹس انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی، لاہور

سلف صالحین کے تصور مراقبہ کو بیان کر رہی ہے اور یہی وہ مراقبہ ہے کہ جس کی صدائے بازگشت آج بھی خطبات حرمین میں ملے گی۔ اس مراقبہ کے جواز میں تو کوئی اختلاف نہیں ہے۔

مراقبہ کا ذکر ہندو ویدوں (Vedas) میں ملتا ہے اور دنیا کی معلوم تاریخ میں ہندومت ہی وہ پہلا مذہب ہے جہاں مراقبہ کو مذہبی شعائر کی حیثیت سے شروع کیا گیا۔ اس کے بعد بدھ مت میں اس کو بہت اہمیت دی گئی۔ سنسکرت زبان میں مراقبہ کے لیے "بھوانا" اور تبت کی زبان میں "گوم" کا لفظ مستعمل ہے۔ سب سے پہلے ہندو مذہبی ادب "اُپنشد" میں ہمیں مراقبہ کا ذکر ملتا ہے۔[1] بدھ مت میں مراقبہ بہت زیادہ ہے بلکہ ان کے ہاں تو اصل عبادت ہی یہی ہے کہ ہفتوں بارہ بارہ گھنٹے مراقبہ ہوتا ہے۔[2]

متقدمین صوفیاء میں مراقبہ رائج نہیں تھا جبکہ متاخرین نے اسے ایک پوری سائنس بنا دیا ہے کہ جس سے بیماریوں کا علاج تک کیا جاتا ہے۔ اس مراقبہ کے لیے درجات، قسمیں، اوقات اور ہدایات کی لمبی چوڑی تفصیلات ہیں۔ مثال کے طور وہ کہتے ہیں کہ مراقبہ کا بہترین وقت طلوع آفتاب سے پہلے ہے یا غروب آفتاب کے بعد اور اس کی ایک معقول وجہ ان کے پاس یہ ہے کہ لاشعوری حواس (unconsciousness) اس وقت میں متحرک ہوتے ہیں یا ہونا شروع کر دیتے ہیں اور شعور سکون میں چلا جاتا ہے یا جانا شروع کر دیتا ہے۔ مراقبہ کے جدید تصور کو جاننے کے لیے سلسلہ چشتیہ عظیمیہ کے روحانی پیشوا خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب کی کتاب "مراقبہ" ایک عمدہ تحریر ہے کہ جس میں انہوں نے روشنیوں کے مراقبے کا تصور دیا ہے۔

صوفیاء کے نزدیک مراقبہ کا اوسط وقت 20 تا 45 منٹ ہوتا ہے اور اس وقت میں آپ نے ایک کم روشنی والی جگہ میں سکون و اطمینان سے بیٹھ جانا ہے اور اپنے حواس معطل کر دینے ہیں۔ آنکھیں، کان اور سوچ کو بند کرتے ہوئے خالی الذہن ہو جائیں۔ اور خالی الذہن ہونے سے مراد تمام سوچوں کو معطل کر کے ایک نقطے پر مرکوز کرنا ہے۔ اوسط مراقبے چار مہینے تک جاری رہتے ہیں لیکن اس طرح کے مراقبوں میں پہلے مہینے میں ہی انسان کو عجیب و غریب مشاہدات کا سامنا ہوتا ہے۔ صوفیاء مراقبوں کے ذریعے عالم مثال، عالم برزخ اور عالم امر کی سیر کرتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ جسے ہماری سیر کا یقین نہ آئے وہ خود سے تجربہ کر کے دیکھ لے۔

صوفیاء یہ کہتے ہیں کہ ظاہری حواس معطل کر دینے اور ذہن کو ایک نقطہ پر مرکوز کر دینے سے لاشعوری طاقتیں (five senses of the soul) نفس میں بیدار ہو جاتی ہیں اور ان کے ذریعے انسان باطنی دنیا کو دیکھنا شروع کر دیتا ہے یعنی وہ دنیا جو وہ موت کے بعد دیکھے گا۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 505ھ) سے لے کر شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 1762ھ) تک بڑے بڑے نام ملتے ہیں جو اس تصور مراقبہ کی کسی نہ کسی درجے میں

---

1 Alexander Berzin, Meditation Methods, Moscow: The Berzinarchives, 2005

2 موسیٰ بھٹو، محمد، مراقبہ، ص29، سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ، حیدر آباد

نہ صرف حمایت کرتے نظر آتے ہیں بلکہ عملاً اس کی مشق بھی کرتے رہے ہیں اور بعض تو باطنی آنکھ کے کھلنے پر قسم کھاتے بھی نظر آتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص فجر کی نماز کے بعد مسجد میں بیٹھ کر پندرہ بیس منٹ کے لیے آنکھیں بند کر کے اپنے حواس معطل کر دے اور ذہن صرف اسی نقطہ پر مرکوز کر دے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہا ہے تو کیا یہ شرعاً جائز ہو گا؟ اور دلیل اس میں حدیث جبرئیل کو بنائے کہ میں وہ کیفیت حاصل کرنے کے لیے مشق کر رہا ہوں کہ اللہ کی ایسے عبادت کروں کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہا ہو، اور اگر اس سوال میں ایک اضافہ یہ بھی کر لیا جائے کہ اگر اس مشق سے واقعتاً اس کو بہت فائدہ ہوتا ہو جیسا کہ صوفیاء نے دعویٰ کیا ہے کہ مراقبہ سے احسان کی کیفیات قطعی طور حاصل ہوتی ہیں تو کیا مقصد شرعی کے حصول کے لیے ایسا کرنا جائز ہو گا؟

ہماری رائے میں اس قسم کے مراقبہ کا ثبوت سنت، صحابہ و تابعین، ائمہ دین، خیر القرون، سلف صالحین اور متقدمین صوفیاء سے نہیں ملتا، لہٰذا ایک بات تو یقینی ہے کہ اس مراقبہ میں کوئی ایسی خیر نہیں ہے جو اس کے بغیر حاصل نہ ہو سکتی ہو۔ اس لیے اس طریقہ کار سے اجتناب کرنا چاہیے کیونکہ اس امت کے متقدمین کو جو خیر حاصل تھا، متاخرین اس کو کبھی نہیں پہنچ سکتے۔ اور وہ خیر متقدمین کو مراقبہ کے بغیر ہی حاصل ہوا تھا۔ دین نے نہ صرف خیر کے بارے بتلایا ہے کہ وہ کیا ہے بلکہ خیر کے حصول کے ذرائع بھی دین ہی کا موضوع ہیں اور دین نے اُن ذرائع کو بھی تفصیل سے بیان کر دیا ہے کہ جن سے وہ خیر حاصل ہو گا، جو آخرت میں نجات کے لیے ضروری ہے۔

صوفیاء کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے غار حرا میں مراقبہ کیا تھا لیکن یہ بات ثابت نہیں ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نبوت سے پہلے غار حرا میں دین ابراہیمی کی بچی کھچی روایات کے مطابق اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عبادت کرتے تھے۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ سے یہ ثابت نہیں ہے کہ نبوت ملنے کے بعد آپ نے کبھی غار حرا کا رخ کیا ہو لہٰذا آپ کا نبوت کے ملنے کے بعد کا عمل اصلاً حجت ہے۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، سلف صالحین اور متقدمین صوفیاء نے مراقبہ کو تقرب الی اللہ کا نہ تو خود ذریعہ بنایا ہے اور نہ ہی اس کی تعلیم دی ہے۔

صوفیاء مراقبہ کے ذریعے سیر الی اللہ، فنا فی اللہ، سیر من اللہ، بقا باللہ کے مراتب سے گزرتے ہیں۔ ان کے بقول وہ مقام اعراف کو دیکھتے ہیں، اپنے رب کا دیدار کرتے ہیں، موت کے بعد کی زندگی کا مشاہدہ کرتے ہیں اور فوت شدگان سے ملاقات کرتے ہیں وغیرہ۔ اور اس سب کچھ کے مشاہدے پر قسمیں کھاتے ہیں۔ یہ دعوے ہزار سال سے بہت لوگ کر رہے ہیں۔ بعض سلاسل میں تو کشف قبور بھی ان کے امتیازات میں شامل ہے جیسا کہ سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کے سالکین کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ قبر میں مردے کو ہونے والی جزا و سزا کے بارے بھی بتلا سکتے ہیں۔

ہمارے نزدیک وہ جمیع موضوعات کہ جن کا تعلق مشاہدات اور مکاشفات سے ہے، علم نفسیات کے تحت داخل ہیں اور انہیں دین کا موضوع نہیں سمجھنا چاہیے لہٰذا مراقبہ دین کا نہیں بلکہ "سائیکالوجی" کا موضوع ہے۔

اگر یہ دین کا موضوع ہوتا تو صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ دین نے اس پر کچھ نہ کچھ تو گفتگو کی ہوتی جبکہ "سائیکالوجی" میں مراقبہ (meditation) ایک پورا میدان ہے اور مغرب میں تو اب پیراسائیکالوجی، یوگا، ٹیلی پیتھی اور میڈی ٹیشن وغیرہ ایک پوری سائنس بن چکا ہے۔

البتہ نبی اور رسول کے مشاہدات اور مکاشفات پر جب بات ہو گی تو اس وقت یہ دین کا موضوع ہوں گے اور ان پر ایمان لانا واجب ہو گا کیونکہ نبی اور رسول ان مشاہدات اور مکاشفات کے لیے مراقبے کے ذریعے تکلف اور تصنع سے کام نہیں لیتے تھے۔ اور جہاں تک صوفیاء کے مشاہدات اور مکاشفات کی بات ہے تو ہمیں جدید علم نفسیات (modern psychology) کی روشنی میں بھی ان کو سمجھنے کی کوشش کرنی ہو گی کہ خود صوفیاء کا ان مشاہدات اور مکاشفات میں اتفاق نہیں اور وہ اس بارے ایک دوسرے کا رد بھی کرتے ہیں کہ جس کے بیان کا یہاں موقع نہیں ہے۔

جہاں تک کشف قبور کی بات ہے تو اسے صوفیاء کے بعض حلقوں کی جانب سے ایسے پیش کیا جاتا ہے جیسے یہ کوئی بہت بڑا روحانی مقام ہو حالانکہ محققین صوفیاء نے کشف اور کرامت کو صوفی کا حیض اور نقص قرار دیا ہے۔[1]

شیخ احمد الرفاعی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 578ھ) فرماتے ہیں:

"الولي لا يظهر الكرامة ولا ترغب للكرامات وخوارق العادات فإن الأولياء يستترون من الكرامات كما تستتر المرأة من الحيض."[2]

"ولی کبھی بھی اپنی کرامت ظاہر نہیں کرتا اور نہ ہی اسے کرامات اور خوارق عادت (supernatural) کے اظہار میں کوئی دلچسپی ہوتی ہے۔ اولیاء تو اپنی کرامات کو یوں چھپاتے پھرتے ہیں جیسے کہ عورت اپنے حیض کو۔"

حیض کی دو تعبیریں کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ جیسے عورت اپنے حیض کو چھپاتی ہے، ایسے ہی صوفی بھی اپنے کشف اور کرامت کو چھپاتا ہے۔ دوسری تعبیر جو نسبتاً زیادہ بہتر ہے، یہ ہے کہ جیسے حیض کے جاری ہونے پر عورت کا اختیار نہیں ہے اور اس کا جاری ہونا اس کے لیے تکلیف، اذیت اور ناپسندیدگی کا باعث ہوتا ہے تو اسی طرح صوفی کو کشف اور کرامت کے جاری ہونے سے کراہت ہوتی ہے۔ پس وہ کوئی بھی ایسا راستہ اختیار نہیں کرتا کہ جو اس کی ذات سے کسی کشف یا کرامت کے صدور کا ذریعہ بنے۔

اصولی بات یہی ہے کہ کرامت تو کجا نبی کا معجزہ بھی اختیاری نہیں ہوتا ہے بلکہ اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ جب

---

[1] الألوسي، شهاب الدين محمود بن عبد الله الحسيني، روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني: 6/ 167، دار الكتب العلمية، بيروت،الطبعة الأولى، 1415 هـ

[2] أحمد بن علي بن ثابت الرفاعي، البرهان المؤيد: ص 128، دار الكتاب النفيس، بيروت 1408هـ

اللہ چاہتے ہیں، معجزے کا صدور ہوتا ہے۔ اسی طرح نبی کی برکت بھی اختیاری نہیں ہوتی بلکہ اللہ کے اذن سے جاری ہوتی ہے کہ ایک بندے کا کھانا ایک جماعت کو کفایت کر جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ نبی اور ولی اپنے ارادے سے جب چاہیں، معجزہ اور کرامت دکھا دیں یا برکت جاری کر دیں بلکہ یہ اسی وقت ہو گا جبکہ اللہ کا اذن اور حکم جاری ہو گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴾[1]

"اور اگر ان کی رُو گردانی آپ پر گراں گزرتی ہے تو اگر آپ کر سکیں تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈ نکالیں یا آسمان میں سیڑھی (تلاش کریں)، پھر ان کے پاس کوئی معجزہ لائیں۔ اور اگر خدا چاہتا تو سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا پس آپ ہرگز نادانوں میں سے نہ ہو جائیں۔"

چلیں! مان لیا کہ آپ کو کشف قبور ہو جاتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اب کیا کریں؟ ایک صوفی سے جب یہ سوال کیا گیا کہ اگر مجھے آپ کے سلسلہ میں شامل ہو جانے کے بعد کشف قبور ہونا شروع ہو گیا تو اس کے بعد مجھے کیا کرنا ہو گا؟ تو صوفی کا جواب یہی تھا کہ شریعت پر عمل کرنا ہو گا۔ اور یہ جواب بالکل صحیح ہے لیکن ہمارا کہنا یہ ہے کہ اس کی دعوت تو دوسرے لوگ کشف قبور کے مقام پر پہنچنے سے پہلے سے ہی دے رہے ہیں۔ اگر وہاں پہنچنے کے بعد بھی یہی کام کرنا ہے تو اس مشق (exercise) کا کیا فائدہ؟

اسی طرح مراقبے کے ذریعے صوفیاء کو جو مشاہدات ہوتے ہیں، ان میں ایک مشاہدہ "مشاہدہ حق" یا "مشاہدہ وجود" بھی ہے۔ صوفیاء کی ایک بڑی جماعت کا دعویٰ ہے کہ ہم اس دنیا میں رہتے ہوئے اللہ عزوجل کو یا صفت وجود حق سبحانہ وتعالیٰ کو اپنی روح کی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں لیکن اس کے لیے روح کی پرواز کی مشق کرنی پڑے گی اور وہ مراقبہ سے ہو گی۔ اس کا دعویٰ بھی کافی صوفیوں نے کیا ہے۔ اس سے اتنی بات تو کہی جا سکتی ہے کہ وہ کچھ دیکھتے ضرور ہیں، لیکن کیا دیکھتے ہیں؟ اس میں بحث ہو سکتی ہے؟ مثلاً آپ ابھی اگر اپنا سر جھکا کر اپنی آنکھیں کچھ دیر کے لیے بند کر لیں تو کچھ نہ کچھ تو نظر آنا شروع ہو ہی جائے گا کیونکہ انسانی ذہن کی بنیادی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ تصور (imagination) کرتا رہے، چاہے نیند میں ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ مشاہدات میں اختلاف نہیں ہے کہ وہ ہوتے ہیں کیونکہ انسان اور اس کا دماغ بہت ہی پراسرار شیء ہے جس کا کسی قدر اندازہ "سائیکالوجی" کے طالب علموں کو ہے۔

اس بارے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جس طرح ظاہری حواس (senses) خطاء کرتے ہیں جسے خطائے حس (hallucination) کہتے ہیں، اسی طرح باطنی حواس بھی خطاء کر جاتے ہیں۔ یہ بات رجال تصوف میں سے

[1] سورۃ الأنعام:6: 35

بھی بعض محققین نے کی ہے جیسا کہ حضرت شیخ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 1624ھ) کی مثال دی جاسکتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"عجب کاروبار ہے کہ ان لوگوں میں سے بہت سے اس راہ کے مدعی اس شہود ومشاہدہ پر بھی قناعت نہیں کرتے بلکہ اس شہود کو تنزل خیال کر کے اس جہاں میں رویت بصری کے بھی قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم واجب الوجود جل سلطانہ کی ذات پاک کو دیکھتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ دولت جو ہمارے پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام کو شب معراج میں ایک دفعہ حاصل ہوئی تھی ہم کو ہر روز میسر ہے اور وہ نور جو ان کے دیکھنے میں آتا ہے اس کو صبح کی سفیدی سے تشبیہ دیتے ہیں اور اس نور کو مرتبہ بے کیفی خیال کرتے ہیں، اور مراتب عروج کی نہایت اس نور کے ظہور تک تصور کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سبحانہ اس بات سے جو ظالم کہتے ہیں، بہت بڑا ہے۔ اور نیز حضرت حق جل شانہ کے ساتھ اپنا کلام ومکالمہ کرنا ثابت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے ایسا ایسا فرمایا ہے، کبھی اپنے دشمنوں کے حق میں حضرت عز سبحانہ کی طرف سے کئی کئی قسم کی وعیدیں یعنی بہت سے عذاب نقل کرتے ہیں، اور کبھی اپنے دوستوں کو بشارتیں دیتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض اس طرح کہتے ہیں کہ رات کے بقیہ تہائی یا چوتھائی حصہ سے لیکر صبح کی نماز تک میں حق سبحانہ وتعالیٰ کے ساتھ کلام کرتا رہا اور ہر طرح کی باتیں پوچھتا رہا اور جواب لیتا رہا، ان لوگوں نے اپنے آپ میں تکبر کیا اور بڑی سرکشی کی۔ ان لوگوں کی باتوں سے مفہوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس نور مرئی کو عین جل سلطانہ سمجھتے ہیں اور اس نور کو حق تعالیٰ کی ذات تصور کرتے ہیں، نہ یہ کہ اس کے ظہورات میں سے کوئی ظہور یا اس کے ظلال میں سے کوئی ظل جانتے ہوں۔ اس میں کوئی کچھ شک نہیں کہ اس نور کو حق جل سلطانہ کی ذات کہنا محض افتراء، صرف الحاد اور خالص زندقہ ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ جل شانہ کا نہایت ہی حلم وتحمل ہے کہ اس قسم کے مفتریوں کے لیے طرح طرح کے عذابوں میں جلدی نہیں کرتا اور ان کی بیخ کنی نہیں فرماتا۔"[1]

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

"اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی قوم صرف رویت کی طلب ہی کی وجہ سے ہلاک ہو گئی اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے طلب رویت کے بعد (لن ترانی) کا زخم کھایا اور بیہوش ہو کر گر پڑے اور اس طلب سے تائب ہوئے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب رب العالمین اور تمام اولین وآخرین موجودات میں سے بہترین ہیں باوجود یکہ معراج بدنی سے مشرف ہوئے اور عرش وکرسی سے گذر کر مکان وزمان سے بھی بالا چلے گئے، باوجود قرآنی اشاروں کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت میں بھی علماء کا اختلاف ہے اور اکثر علماء نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عدم رویت کے قائل ہیں، چنانچہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 505ھ) فرماتے ہیں: صحیح یہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی شب میں اپنے رب کو

[1] مکتوبات حضرت مجدد اَلف ثانی، دفتر دوم، مکتوب نمبر 1، مترجم مولانا سید زوار حسین شاہ: ص 315-316، مکتبہ مجددیہ، کراچی

نہیں دیکھا۔ لیکن یہ بے سروسامان اپنے خیال باطل میں ہر روز خدائے جل شانہ کو دیکھتے ہیں جبکہ حال یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ایک مرتبہ دیدار میں بھی علماء قیل و قال کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو خوار کرے، کس قدر جاہل ہیں۔"[1]

ماہرین نفسیات کی ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ اس قسم کے تجربات میں سالک، حالت مراقبہ میں اپنے ہونے کی شعوری کیفیت عارضی طور کھو دیتا ہے۔ اور یہی ہماری رائے میں اس کیفیت کا صحیح تجزیہ ہے۔ صوفیاء میں عام طور اس کیفیت کو فنا (annihilation) اور سائیکالوجی میں نفسیاتی موت (psychic death) کہہ دیتے ہیں۔ اس بارے جدید علم نفسیات میں شعور کی تبدیل شدہ کیفیات اور حالتوں میں سے خود دگربینی (depersonalization)، وجد (religious ecstasy)، تجربہ بیرون جسم (out of body experience) اور تخلیہ روح (astral projection) کا مطالعہ مفید رہے گا۔

مراقبہ اور ارتکاز ذہنی

مراقبہ میں ایک چیز اہم ہے اور وہ حواس ظاہری (five senses) کے تعطل کی مشق کرنا کہ اس سے مقصود یہ ہو کہ عبادت میں توجہ اللہ عزوجل ہی کی طرف مبذول رہے۔ باقی رہے اس کے اوقات یا ہیئت تو یہ درست نہیں ہے۔ مثال کے طور ہیئت کے بارے صوفیاء کا کہنا ہے کہ مراقبہ میں آنکھیں بند ہونی چاہییں۔ ہماری رائے میں اس کا تعلق مراقبے سے نہیں ہونا چاہیے کیونکہ حواس کا تعطل کھلی آنکھوں بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ بعض لوگوں کی سوتے میں آنکھیں کھلی ہوتی ہیں۔ اسی طرح اگر ہم سڑک پر سفر کر رہے ہوں تو راستے میں سینکڑوں چیزیں دیکھتے ہیں اور جن چیزوں میں ہماری دلچسپی نہیں ہوتی، انہیں دیکھنا یا نہ دیکھنا ہمارے لیے برابر ہوتا ہے۔ پس اصل مقصود توجہ کو مرکوز (concentrate) کرنا ہے نہ کہ آنکھیں بند کرنا۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و تابعین یا ائمہ و محدثین ایسے مراقبہ نہیں کرتے تھے جیسا کہ معاصر صوفیاء کرتے ہیں، لہٰذا تزکیہ نفس کے لیے اس طرح کے مراقبے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ سلف صالحین کا تزکیہ اس قسم کی مشقوں کے بغیر ہوا ہے۔ البتہ صوفیاء کی بعض باتیں قابل توجہ معلوم ہوتی ہیں جیسا کہ ان کا یہ کہنا ہے کہ اللہ کی طرف کامل توجہ کے لیے حواس ظاہری کو معطل کر دینے کی مشق کرنا۔ اس بنیاد کو سامنے رکھتے ہوئے اگر ہم مراقبے کی بہترین صورت متعین کرنا چاہیں تو وہ تہجد کی نماز ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کو سورۃ المزمل میں تہجد کی نماز پڑھنے کا حکم دینے کے بعد فرمایا گیا:

﴿إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْئًا وَأَقْوَمُ قِيلًا ۝ إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا ۝ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ

[1] ایضاً: ص316

اِلَيۡهِ تَبۡتِيۡلًا ﴿٨﴾[1]

"یقیناً رات کا قیام نفس کو کچلنے میں سب سے زیادہ معاون اور بات کہنے میں سب سے زیادہ سیدھا ہے۔ بے شک دن میں آپ کے بہت سے کام ہیں۔ (پس رات کے قیام میں) آپ اپنے رب کے نام کا ذکر کریں اور سب کچھ سے کٹ کر صرف اسی کے ہو رہیں۔"

امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ "تبتّل" کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قُلْتُ: التَّبَتُّلُ يَجْمَعُ أَمْرَيْنِ اتِّصَالًا وَانْفِصَالًا. لَا يَصِحُّ إِلَّا بِهِمَا. فَالِانْفِصَالُ: انْقِطَاعُ قَلْبِهِ عَنْ حُظُوظِ النَّفْسِ الْمُزَاحِمَةِ لِمُرَادِ الرَّبِّ مِنْهُ. وَعَنِ الْتِفَاتِ قَلْبِهِ إِلَى مَا سِوَى اللهِ، خَوْفًا مِنْهُ، أَوْ رَغْبَةً فِيهِ، أَوْ مُبَالَاةً بِهِ، أَوْ فِكْرًا فِيهِ، بِحَيْثُ يُشْغَلُ قَلْبُهُ عَنِ اللهِ. وَالِاتِّصَالُ: لَا يَصِحُّ إِلَّا بَعْدَ هَذَا الِانْفِصَالِ. وَهُوَ اتِّصَالُ الْقَلْبِ بِاللهِ، وَإِقْبَالُهُ عَلَيْهِ، وَإِقَامَةُ وَجْهِهِ لَهُ، حُبًّا وَخَوْفًا وَرَجَاءً، وَإِنَابَةً وَتَوَكُّلًا.[2]

"میری رائے میں ''تبتل'' میں دو چیزیں شامل ہیں۔ ان میں سے ایک انقطاع (detachment) ہے اور دوسرا اتصال (attachment)۔ ان دونوں کے بغیر "تبتل" ممکن نہیں ہے۔ انقطاع سے مراد یہ ہے کہ سالک اور عابد کا دل اپنے رب کی مراد تک پہنچنے میں حائل ہونے والے نفس سے اس طرح کٹ جائے کہ اس کا دل اللہ کے ماسوا کی طرف مشغول نہ ہو اور اللہ کے علاوہ کی طرف اس کے دل کی توجہ بھی ختم ہو جائے، چاہے اللہ کے غیر میں یہ توجہ کسی خوف کے سبب سے ہو یا رغبت کی قبیل سے ہو، پرواہ کی غرض سے ہو یا غور فکر کی وجہ سے ہو۔ اور اتصال اُسی وقت ممکن ہے جبکہ پہلے انقطاع ہو۔ اور اتصال سے مراد دل کو اللہ کی طرف لگانا، اپنے دل اور چہرے کو اس کی طرف متوجہ کرنا، اس کی محبت، اس کے خوف، اس سے امید، اس کی طرف رجوع اور اس پر توکل کرتے ہوئے۔"

پس ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ "تبتل" سے مراد دنیا و مافیہا سے ایسا کامل انقطاع (total detachment) ہے جو اللہ کی طرف توجہ کامل (complete devotion) کا سبب بنے گا۔ یہ وہی بات ہے جسے نبی کریم ﷺ نے «أَنْ تَعْبُدَ اللهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ» کے الفاظ میں بیان کیا ہے یعنی اللہ کی ایسے عبادت کرو گویا کہ تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، یا کم از کم ایسے کہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔[3]

---

1 سورة المزمل: 73: 8-9

2 ابن قيم الجوزية، محمد بن أبي بكر، مدارج السالكين بين منازل إياك نعبد وإياك نستعين: 2/ 32، دار الكتاب العربي، بيروت، الطبعة الثالثة، 1996م

3 البخاري، أبو عبد الله محمد بن إسماعيل، صحيح البخاري، كِتَابُ الإِيمَانِ بَابُ سُؤَالِ جِبْرِيلَ النَّبِيَّ ﷺ عَنِ الإِيمَانِ: 50، دار السلام للنشر والتوزيع، الرياض، الطبعة الثانية، 1999م

مراقبہ کا مقام نماز ہے۔ اور نماز میں بھی خاص طور تہجد کی نماز جبکہ مکمل خاموشی ہوتی ہے کیونکہ فرض نمازوں میں کامل توجہ کی کیفیت حاصل ہونا مشکل ہے۔ فرض نمازوں میں اللہ کے رسول ﷺ بچے کے رونے کی آواز سن کر نماز ہلکی کر دیتے تھے۔ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 1943ء) نے لکھا ہے کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ فرائض میں استغراق مطلوب نہیں ہے۔[1]

مراقبے کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ انسان تہجد کی نماز میں قرآن مجید کی تلاوت کرے اور تلاوت، قیام، رکوع، سجود اور ان میں پڑھی جانے والی تسبیحات میں تبتل اور انقطاع یعنی دنیا و مافیہا سے کٹ جانے کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ اگر انقطاع حاصل نہ ہو رہی ہو تو آنکھیں بھی بند کی جا سکتی ہیں جیسا کہ امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ نماز میں خشوع و خضوع کے حصول لیے آنکھیں بند کرنا جائز ہے[2] کیونکہ خشوع و خضوع کا حصول نماز کے فرائض میں شامل ہے لیکن مستحب اور پسندیدہ امر یہی ہے کہ نماز میں آنکھیں کھولے رکھے۔ توجہ الی اللہ کا پہلا قدم دنیا و مافیہا سے انقطاع ہے۔ دنیا و مافیہا سے انقطاع ہو گا تو توجہ کے حصول کا آغاز ہو گا۔ انقطاع کے بعد توجہ میں بہتری کے لیے قرآن مجید کی آیات اور تسبیحات کے معنی و مفہوم پر غور کرے۔ اگر انقطاع نہیں ہو گا تو نماز میں توجہ بھی قائم نہ ہو گی۔

ایک شبہ یہ ہو سکتا ہے کہ مراقبے میں تو کسی ایک تصور پر غور کیا جاتا ہے تا کہ ارتکاز ذہنی (concentration) حاصل ہو تو قرآن مجید کی آیات کے معانی و مفاہیم میں غور کرنے کی صورت میں سالک متنوع مضامین پر غور کرے گا تو مرکزیت کیسے قائم ہو گی؟ ذہن تو اِدھر اُدھر منتقل ہوتا رہے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید اللہ کی صفت ہے۔ اور صفت الٰہی ہونے کے اعتبار سے وہ ایک ہے، اگرچہ مضامین کے اعتبار سے تنوع ہے۔ قرآن مجید میں غور و فکر ایک اعتبار سے صفت کلام میں غور کرنا ہے۔

اس دنیا میں اللہ کی ذات کے تعارف کا سب سے بڑا ذریعہ اس کی صفات ہی ہیں کہ جسے ہم توحید اسماء و صفات کا نام دیتے ہیں اور اس کے قرب کا ذریعہ بھی اس کی صفات ہی ہیں۔ اور ان جمیع صفات میں اللہ اور انسان کے مابین تعلق قائم کرنے کے لیے جو اہم ترین صفت ہے، وہ صفت کلام ہے یعنی قرآن مجید۔ پس تہجد کی نماز میں لمبے قیام کے ساتھ قرآن مجید کی آیات میں غور و فکر ہی مراقبہ کی بہترین صورت ہے۔

مشارطہ، مراقبہ اور محاسبہ

مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 1943ء) نے مراقبہ نماز کا اہتمام سے ذکر کیا ہے۔ انہوں نے مراقبہ

[1] کیلانی، عبد الرحمن، مولانا، شریعت و طریقت: ص 314، مکتبۃ السلام، وسن پورہ، لاہور، طبع ہفتم، 2006ء

[2] ابن قيم الجوزية، محمد بن أبي بكر، زاد المعاد في هدي خير العباد: 1/ 285، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة السابعة والعشرون، 1994م

کے ساتھ مشارطہ اور محاسبہ دو اور اصطلاحات بھی نقل کی ہیں۔ ان سے پہلے امام ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہ اصطلاحات بیان کی ہیں۔[1]

مشارطہ، شرط سے باب مفاعلہ ہے۔ صبح اٹھ کر اپنے نفس کو یہ تلقین کرے کہ آج کے دن میں یہ خیر کا کام کرنا ہے اور اس شر سے بچنا ہے تو یہ مشارطہ ہے۔ اور مراقبہ سے مراد یہ ہے کہ اپنے نفس کو کی گئی اس تلقین کی دن بھر نگہداشت اور نگرانی کرے۔ محاسبہ یہ ہے کہ رات کو یہ معلوم کرنے کے لیے بیٹھے کہ جس خیر کے حصول اور شر سے اجتناب کے مقصد سے صبح مشارطہ کیا تھا، وہ مقصد حاصل ہوا یا نہیں۔[2] حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے صوفیاء کے مراقبے کو سنت کے قریب کر دیا ہے۔ مراقبے کے اس تصور میں اختلاف نہیں ہے۔

اندر کا سکون

ایک دوست نے مذکورہ بالا تحریر پر سوال کیا کہ اگر جم جوائن کرنا جائز ہے تو مراقبہ کیوں نہیں ہو سکتا۔ اس کے جواب میں ہمیں یہی عرض کرنا ہے کہ فریقین عموماً ایک دوسرے کی تحریر غور سے پڑھتے نہیں اور سرسری طور نظر ڈال کر ایسے اعتراض وارد کر دیتے ہیں، جو بنتے نہیں ہیں۔ ہمیں آپ کے مراقبہ کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے، روزانہ کریں، صبح و شام کریں۔

ہم بار بار یہ نکتہ پیش کر رہے ہیں کہ ایک ذہن ہے کہ مراقبہ کو ذہنی سکون کے لیے اختیار کیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اور دوسرا ذہن ہے کہ مراقبہ تقرب الی اللہ کے ذرائع میں سے ہے، تو بہت حرج ہے۔ اگر آپ یوگا اپنی صحت کے لیے کریں گے تو کوئی حرج نہیں لیکن اگر آپ یہ کہیں گے کہ میں یوگا اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے کر رہا ہوں، تو بہت حرج ہے۔ اسی طرح آپ اپنی جسمانی صحت کے لیے جم جوائن کریں تو کوئی حرج نہیں لیکن آپ اس لیے جم جوائن کریں کہ یہ تقرب الی اللہ کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے، تو بہت حرج ہے۔

تقرب الی اللہ کے ذرائع ہمارے دین نے طے کر دیے ہیں، اور وہ ایمان، نماز، قرآن مجید، سجدہ، دعا، صدقہ، صلہ رحمی اور اخلاق وغیرہ ہیں۔ ان کے علاوہ کسی ذریعے کو اللہ کا تقرب حاصل کرنے کا ذریعہ بنانا درست نہیں ہے۔ اور اگر آپ کو باطنی اطمینان اور ذہنی سکون کے لیے مراقبہ کرنا ہی ہے، تو پھر صوفیاء سے زیادہ بہتر ہندو جوگی اور بدھ بھکشو ہیں کہ جن کا یہ خاص میدان ہے۔ اگر آپ مراقبے کے تصور پر تصوف، ہندومت اور بدھ مت کا تقابلی مطالعہ کریں تو احساس پیدا ہو گا کہ ہمارے صوفیاء اس سائنس میں غیر مسلموں سے کافی پیچھے ہیں۔ مثال کے

---

[1] ابن جوزی، عبد الرحمن علامہ، منہاج القاصدین، تلخیص ابن قدامہ مقدسی احمد بن محمد بن عبد الرحمن، مترجم محمد سلیمان کیلانی، ص523-524، ادارہ معارف اسلامی، لاہور، 1985

[2] شریعت و طریقت: ص278

طور آپ کسی سلسلے کے معاصر پیر طریقت کے ساتھ مراقبہ میں بیٹھ جائیں اور اس کے بعد کسی ہندو جوگی کی باتیں سنیں، اور جوگی تو خیر بہت آگے ہوگا، آپ ایک ہندو نوجوان سندیپ مہیش واری کے بیانات ہی سن لیں جو کہ آپ کو یوٹیوب پر مل جائیں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا، کہ مراقبے کی لذات، کیفیات اور ثمرات جو ان کے ہاں ہیں، وہ یہاں کہاں؟[1]

لیکن حقیقت یہ ہے کہ تہجد کی نماز میں قرآن مجید کی تلاوت اور لمبے سجود میں لمبی دعاؤں میں جو ایمانی کیفیات اور اثرات ہیں، وہ مراقبہ میں کہاں؟ اور اس پر قسم کھائی جاسکتی ہے کہ ہندومت اور بدھ مت کے طریقوں سے وہی متاثر ہوگا جو اسلام کے طریقوں سے محروم رہا۔ ایک دوست نے بائیبل پڑھی تو بہت متاثر ہوئے اور کہنے لگے کہ بائیبل کا کورس کرنے کا ارادہ ہے، آپ کا کیا مشورہ ہے؟ میں نے کہا کہ قرآن مجید پڑھا ہے؟ کہنے لگے کہ نہیں! میں نے کہا کہ پہلے قرآن مجید اچھی طرح پڑھ لیں۔ اور اگر آپ نے قرآن مجید پڑھا ہی نہیں تو آپ کو بائیبل ہی سب کچھ معلوم ہوگی۔ تو ہندو جوگیوں اور بدھ بھکشوؤں کا تو یہ عذر ہے کہ وہ اصلاح نفس کے اسلام کے طریقوں سے واقف نہیں ہیں لیکن مسلمان تو واقف ہیں اور ان کو پریکٹس میں نہیں لاتے اور دوسرے طریقوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔

اور اگر آپ کو زندگی میں ایک بار بھی تہجد میں اللہ سبحانہ وتعالی کو مکمل قرآن مجید سنانے کا موقع نہیں ملا تو آپ مراقبے کی کیفیات کو بہت بڑا جانیں گے کہ جس نے دیسی گھی کی لذت نہ لی ہو تو اسے تو ڈالڈا ہی میں سب ذائقے معلوم ہوں گے۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ جس طرح عام افراد قرآن مجید سے احوال پیدا کرنے سے محروم ہیں، اسی طرح صوفیاء بھی قرآن مجید سے احوال پیدا کرنے میں اتنے ہی محروم ہیں۔ اگر صوفیاء کو قرآن مجید سے احوال پیدا ہوتے تو انہیں مراقبے، تصور شیخ، ذکر جہری، پاس انفاس، سماع، رقص اور وجد وغیرہ کی طرف جانے کی کیا ضرورت تھی؟ اہل تصوف کو یہ ماننا پڑے گا کہ وہ قرآن مجید سے وہ تعلق قائم کرنے میں ناکام رہے ہیں جیسا کہ ہونا چاہیے تھا۔ اور اس کا حل اب یہی ہے کہ اصحاب قرآن اور اہل قرآن کی صحبت میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارا جائے۔ اللہ کے رسول ﷺ یہ کہیں کہ بندہ سجدے کی حالت میں جتنا اپنے رب کے قریب ہوتا ہے، اتنا کسی اور حالت میں نہیں ہوتا اور ہم مراقبے کی حالت میں تقرب کی منازل طے کر رہے ہوں تو اس سے بڑی محرومی اور کیا

[1] آجکل بابا رام دیو اور سری سری راوی شنکر مراقبہ کروانے کے حوالے سے کافی معروف ہندو گرو ہیں۔ دونوں کے ایسے پیروکار لاکھوں میں ہیں کہ جنہیں مراقبہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جمعیت علمائے ہند کے اتر پردیش میں 2009ء کے سالانہ اجلاس میں بابا رام دیو کی مراقبہ، پاس انفاس اور لطائف پر تقریر سننے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں یہ طریقے ہندومت سے آئے ہیں۔ خیر یہ دونوں گرو تو پھر میڈیا کے لوگ ہیں جبکہ جنگلوں، پہاڑوں اور دریاؤں کے کنارے سنیاسی اور بھکشو تو اس کے علاوہ ہیں کہ جن کے عجیب وغریب مکاشفات بھی منقول ہیں۔

ہو گی؟ روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «أَقْرَبُ مَا يَكُونُ الْعَبْدُ مِنْ رَبِّهِ، وَهُوَ سَاجِدٌ، فَأَكْثِرُوا الدُّعَاءَ»[1]

"سیدنا ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ اپنے رب کے سب سے زیادہ قریب سجدے کی حالت میں ہوتا ہے۔ پس اس حالت میں بہت زیادہ دعائیں کیا کرو۔"

اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تقرب الی اللہ کا سب سے بڑا ذریعہ فرائض پر عمل کو قرار دیا ہے۔ اور فرائض کے بعد اللہ کا قرب حاصل کرنے کا دوسرا ذریعہ نوافل ہیں۔ اور تیسرا کوئی ذریعہ ہمارے دین نے بیان نہیں کیا لہٰذا مراقبہ، لطائف، پاس انفاس، تصور شیخ، سماع اور وجد "بزرگ" بننے کے ذرائع تو ہو سکتے ہیں لیکن "بندہ" بننے کے نہیں۔ جسے بزرگی چاہیے، وہ تصوف کے ذرائع پر عمل کر لے، بزرگ بن جائے گا۔ اور جسے بندگی چاہیے، وہ دین کے ذرائع پر عمل کر لے، اللہ عزوجل "عباد الرحمن" میں شامل فرمائیں گے۔ ان شاء اللہ! ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ اللهَ قَالَ: مَنْ عَادَى لِي وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ، وَمَا تَقَرَّبَ إِلَيَّ عَبْدِي بِشَيْءٍ أَحَبَّ إِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ، وَمَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتَّى أُحِبَّهُ، فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ: كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ، وَبَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهِ، وَيَدَهُ الَّتِي يَبْطِشُ بِهَا، وَرِجْلَهُ الَّتِي يَمْشِي بِهَا، وَإِنْ سَأَلَنِي لَأُعْطِيَنَّهُ، وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِي لَأُعِيذَنَّهُ، وَمَا تَرَدَّدْتُ عَنْ شَيْءٍ أَنَا فَاعِلُهُ تَرَدُّدِي عَنْ نَفْسِ الْمُؤْمِنِ، يَكْرَهُ الْمَوْتَ وَأَنَا أَكْرَهُ مَسَاءَتَهُ»[2]

"سیدنا ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے میرے کسی ولی سے دشمنی کی تو میرا اس کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ اور میرے بندے کے پاس، تقرب کے اُن ذرائع میں سے کہ جو مجھے محبوب ہیں، فرائض سے بڑھ کر کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے کہ جس سے وہ میرا تقرب حاصل کر سکے۔ اور میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا تقرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ میرا محبوب بن جاتا ہے۔ اور جب وہ میرا محبوب بن جاتا ہے تو میں اس کی سماعت بن جاتا ہوں کہ جس سے وہ سنتا ہے۔ اور میں اس کی بصارت بن جاتا ہوں کہ جس سے وہ دیکھتا ہے۔ اور میں اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں کہ جس سے وہ پکڑتا ہے۔ اور میں اس کے پاؤں بن جاتا ہوں کہ جس سے وہ چلتا ہے۔ اور اگر مجھ سے سوال کرے تو ضرور اس کا سوال پورا کرتا ہوں۔ اور مجھ سے پناہ مانگے تو ضرور اس کو پناہ دیتا ہوں۔ مجھے اپنے کسی کام میں تردد نہیں ہوتا لیکن مومن کی جان قبض کرنے

---

[1] النيسابوري، مسلم بن الحجاج القشيري، صحيح مسلم، كِتَابُ الصَّلَاةِ، بَابُ مَا يُقَالُ فِي الرُّكُوعِ وَالسُّجُودِ: 482، دار السلام للنشر والتوزيع، الرياض، الطبعة الأولى، 1998م

[2] صحيح البخاري، كِتَابُ الرِّقَاقِ، بَابُ التَّوَاضُعِ: 6502

میں تردد ہوتا ہے کہ مومن موت کو ناپسند جانتا ہے اور مجھے مومن کی ناپسندیدگی گراں گزرتی ہے۔"

اس حدیث میں اولیاء اللہ انہی کو قرار دیا گیا ہے جو فرائض اور نوافل کے راستے اللہ کا تقرب حاصل کرتے ہیں۔ اور ان کی ایک علامت ان کا مستجاب الدعوات ہونا اور دوسری موت کو ناپسند جاننا ہے۔ اگر موت پسند ہو تو پھر بزرگی کے راستے پر ہے، بندگی پر نہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کے الفاظ میں غور کیا جائے تو بہت بلیغ ہیں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ أَحَبَّ لِقَاءَ اللهِ، أَحَبَّ اللهُ لِقَاءَهُ، وَمَنْ كَرِهَ لِقَاءَ اللهِ، كَرِهَ اللهُ لِقَاءَهُ» فَقُلْتُ: يَا نَبِيَّ اللهِ أَكَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ؟ فَكُلُّنَا نَكْرَهُ الْمَوْتَ، فَقَالَ: «لَيْسَ كَذَلِكَ، وَلَكِنَّ الْمُؤْمِنَ إِذَا بُشِّرَ بِرَحْمَةِ اللهِ وَرِضْوَانِهِ وَجَنَّتِهِ، أَحَبَّ لِقَاءَ اللهِ، فَأَحَبَّ اللهُ لِقَاءَهُ، وَإِنَّ الْكَافِرَ إِذَا بُشِّرَ بِعَذَابِ اللهِ وَسَخَطِهِ، كَرِهَ لِقَاءَ اللهِ، وَكَرِهَ اللهُ لِقَاءَهُ»[1]

"سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ جسے اللہ سے ملنا محبوب ہو، اللہ کو بھی اس سے ملنا پسند ہے۔ اور جسے اللہ سے ملاقات ناپسند ہو، اللہ کو بھی اس سے ملاقات ناپسند ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے کہا: اے نبی ﷺ! کیا اللہ سے ملاقات کو ناپسند جاننے سے مراد موت کو ناپسند جاننا ہے۔ ہم تو موت کو ناپسند جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ایسا نہیں ہے بلکہ بندہ مومن کو آخر وقت میں جب اللہ کی رحمت، اس کی رضا اور جنت کی بشارت دی جاتی ہے تو اس کا اللہ سے ملاقات کا شوق بڑھ جاتا ہے اور اللہ بھی اس کی ملاقات کو پسند کرتے ہیں۔ اور کافر کو جب اللہ کے عذاب اور غضب کی بشارت دی جاتی ہے تو وہ اللہ سے ملاقات کو ناپسند جانتا ہے اور اللہ عزوجل بھی اس سے ملاقات کو پسند نہیں کرتے ہیں۔"

اندر کا سکون کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ یہ تو ہندو، عیسائی اور بدھ بھی حاصل کر لیتے ہیں اور شاید مسلمان صوفیاء سے زیادہ حاصل کر لیتے ہیں۔ اصل شیء یہ ہے کہ کس حالت میں یا کیا کام کرنے کے نتیجے میں آپ کو وہ سکون حاصل ہوا ہے؟ اگر تو وہ کام ایسا ہے کہ جس کے ذریعے اللہ کے رسول ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے سکون حاصل کیا تو اس سے حاصل شدہ سکون بلاشبہ اللہ ہی کی طرف سے ہے جیسا کہ روایات میں ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت سے سکینت نازل ہوتی ہے تو ایسا سکون تو قطعی طور اللہ ہی کی طرف سے ہے لیکن وہ سکون جو دیگر طریقوں سے حاصل ہو سکتا ہے تو اس کی نسبت قطعی طور پر اللہ کی طرف کرنا درست نہیں ہے۔ ہمارے دوست عظیم الرحمن عثمانی اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"پچھلی نوکری میں میرا مینجر ایک ایسا مخلص عیسائی تھا جو سنجیدگی سے نوکری چھوڑ کر اپنے علاقائی گرجا گھر کا سربراہ بننے کا متمنی تھا۔ جب اسے میرے مذہبی رجحان سے آگاہی ہوئی تو اکثر مجھ سے بہانے بہانے گفتگو کرتا تاکہ مجھ پر

[1] صحيح مسلم، كتاب الذِّكْرِ وَالدُّعَاءِ وَالتَّوْبَةِ، بَابُ مَنْ أَحَبَّ لِقَاءَ اللهِ أَحَبَّ اللهُ لِقَاءَهُ: 2684

عیسائیت کی حقانیت کو ثابت کر سکے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ معاذ اللہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام خدا ہیں اور ساتھ ہی خدا کے بیٹے بھی ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ مجھے پورے اعتماد سے بتاتا کہ خدا روز مجھ پر وحی کرتا ہے اور مجھ سے مخاطب ہوتا ہے۔ دھیان رہے کہ وہ روزمرہ کی زندگی میں بلاشبہ ایک ذہین، فطین اور نفیس انسان تسلیم کیا جاتا تھا۔ میں نے اس سے اس کی اس وحی کی کیفیت پوچھی تو اس نے بتایا کہ وہ باقاعدہ ایک آواز سنتا ہے جو اس کے جسمانی کان میں نہیں بلکہ دماغ میں گونجتی ہے۔ یہ آواز اسے بتاتی ہے کہ اسے آج کیا کیا اچھے کام کرنے ہیں؟ اکثر اسے ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جو اسے معلوم ہونا ناممکن تھیں۔ مثال کے طور پر یہ آواز اسے حکم دیتی کہ فلاں شخص کے پاس جاؤ اور اسے تسلی دو کہ اس کا باپ اس سے ناراض نہیں ہے۔ جب اس نے جا کر یہ پیغام مطلوبہ انسان تک پہنچایا تو وہ شخص روہانسا ہو گیا اور اس نے بتایا کہ ابھی چند روز پہلے ہی اس کے باپ کا انتقال ہوا ہے جسے وہ بہت یاد کرتا ہے۔ اسی طرح ایک بار اس نے مجھے میری بیوی کی دیرینہ بیماری کا نہایت پیچیدہ نام بتایا جو کہ ان ہی دنوں میڈیکل رپورٹس میں مجھے معلوم ہوئی تھی اور اسے میرے سوا کوئی دوسرا آفس میں نہیں جانتا تھا۔ یہ بات بتا کر اسے ایسا لگا کہ شاید میں اس سے مرعوب ہو جاؤں گا اور شاید مجھے کسی حد تک مرعوب ہو بھی جانا چاہیے تھا لیکن میں اپنے مرحوم شیخ کی بدولت یہ جانتا تھا کہ نفسی علوم کے ذریعے یا قرین (جن) کا استعمال کر کے کچھ ایسی باتیں جان لینا جو سامنے والے کے ذہن میں پہلے سے موجود ہو کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ میں نے اس مینجر کو پورے سکون سے سمجھایا کہ اس طرح کی شعبدہ بازیاں یا کرامات تو ہر مذہب کا فرد کر لیتا ہے۔ اس سے حق کے حق ہونے کا تعین قطعی نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا فیصلہ تو صرف وحی اور فطرت سلیمہ مل کر ہی کر سکتے ہیں۔ ساتھ ہی میں نے اسے کچھ ذاتی اور کچھ دیگر مسلمانوں کے سچے مافوق الفطرت واقعات سنائے جسے سن کر اس کے چہرے پر فکر کے سائے منڈلانے لگے۔ میرا یہ مینجر ایک نہایت پرسکون نظر آنے والا انسان تھا۔ جس کے سکون کا یہ عالم تھا کہ روز سب کو ای میل کر کے بتاتا کہ آج کا دن رب کی کتنی نعمتوں سے مزین نظر آ رہا ہے۔ البتہ اس کے لئے یہ بات پریشان کن تھی کہ اسے میرا وجود بھی پوری طرح پرسکون نظر آتا۔ اسے یہ بات سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کوئی شخص سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو خدا نہ مانے اور پھر بھی پرسکون رہے، یہ کیسے ممکن ہے؟ دوسری طرف مجھے اعتراف ہے کہ چونکہ میں بھی سکون کو ایمان و عمل کا لازمی نتیجہ مانتا ہوں لہٰذا میں بھی تعجب میں تھا کہ یا اللہ ایک شخص بدترین شرک میں مبتلا ہو کر بھی اس درجہ پرسکون کیسے ہے؟ یہ دوطرفہ حیرت ایک زمانے تک جاری رہی۔ جب بے تکلفی بڑھی تو میں نے کھل کر اس سے عقائد کے متعلق بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک روز ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ صوفے پر بیٹھ کر اسی بارے میں بات کریں گے۔ چنانچہ وہ دن آ گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ کیونکہ تم قرآن حکیم کو اللہ کا کلام نہیں مانتے، اس لئے آج میں تم سے صرف اس کتاب کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں جسے تم اللہ کا کلام مانتے ہو یعنی بائیبل۔ یہ سن کر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس کی حیرت میں اضافے کے لئے میں نے اسے بتایا کہ میں بائیبل سمیت دیگر نمائندہ مذاہب کے کئی صحائف کو پڑھ چکا ہوں۔ اب میں نے

اسے سمجھایا کہ کتنے زیادہ حوالوں سے قرآن اور بائیبل کے ماننے والے ملتے جلتے عقائد کو مانتے ہیں۔ اصل مسئلہ صرف اتنا ہے کہ ہم سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو خدا یا خدا کا بیٹا نہیں بلکہ ایک بہت برگزیدہ پیغمبر تسلیم کرتے ہیں۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے پوچھا کہ اب تم مجھے کوئی ایک بھی آیت بائیبل سے ایسی پیش کر دو جس میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے خدائی کا دعویٰ کر کے اپنی عبادت کا حکم دیا ہو۔ یہ سن کر اس نے وہ آیات یکے بعد دیگرے سنانی شروع کیں جو دراصل کوئی دوسری بات بیان کر رہی تھیں۔ میں ایک ایک کر کے اس کی پیش کردہ آیات کو واضح کرتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کو اعتراف کرنا پڑا کہ ایسی کوئی آیت براہ راست موجود نہیں۔ میں نے مسکرا کر اسے سمجھایا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنا بڑا عقیدہ واضح الفاظ میں موجود ہی نہ ہو؟ اس کے چہرے کی مسکراہٹ اب پھیکی سی تھی۔ میں نے اب ان حوالوں کو بائیبل سے بیان کرنا شروع کیا جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام ایک ہی آسمانی باپ یعنی خدا کی جانب بلاتے رہے اور اسی کو خود بھی سجدہ کرتے رہے۔ اس نے اقرار کیا کہ ابھی اس کے پاس اس کا جواب نہیں اور وہ اس بارے میں تحقیق کر کے بتائے گا۔ یوں ہماری نشست ختم ہوئی۔ اس کے بعد کے چند روز میں نے اسے نہایت بے سکونی کی حالت میں دیکھا۔ اس کا وہ سکون اب کہیں غائب ہو گیا تھا جو اس کا خاصہ تھا۔ یہ عقدہ مجھ پر اب کھل چکا تھا کہ جس سکون کو اس مینیجر نے اختیار کیا تھا وہ ایک نقلی نقاب سے زیادہ نہ تھا جو دلائل سے یکدم منہدم ہو گیا تھا۔ چند دن بعد اس نے خود مجھ سے بات کی اور کہا کہ ان باتوں کے جواب نہیں ہیں مگر وہ بنا دلیل اس بات کو مانے گا کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام ہی خدا ہیں کیونکہ وہ اسے وحی کرتے ہیں۔ میں نے جواب میں اسے پھر ان گنت ایسے ہی واقعات سنائے جو مختلف عقائد کے لوگوں کے ساتھ ہوتے آئے ہیں۔ ساتھ ہی ان ذہنی مریضوں کی کہانیاں بھی یاد کروائی جنہوں نے اپنی اولاد کو یا کسی عزیز کو اس لئے قتل کر دیا کہ ان کے بقول خدا نے انہیں ایسا کرنے کی وحی کی تھی۔ اس سب سے گھبرا کر اس نے مجھے ڈرتے ڈرتے اپنے چرچ آنے کی دعوت دی تاکہ میں وہاں کسی سے مل سکوں۔ میں نے دعوت قبول کی اور اللہ سے دعا کر کے مقررہ اتوار کو اس بہت بڑے چرچ میں جا پہنچا۔ وہاں ہوتی ہوئی ہر عبادت کا مشاہدہ کیا اور خیال رکھا کہ کسی شرکیہ عبادت کا حصہ نہ بنوں۔ عبادت کے اختتام پر میرے مینجر نے مجھے اپنے بڑے سے ملوایا۔ اس سے بھی شائستہ مکالمہ ہوا اور زیادہ دیر نہ لگی جب اس کے پاس بھی کہنے کو اس کے سوا کچھ نہ بچا کہ بنا دلیل سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت تسلیم کی جائے معاذ اللہ!۔ اس کے بعد کھانے کی میز پر اس کی بیوی مجھ سے برزخی زندگی کے اسلامی نکتہ نظر کو سمجھتی رہی اور اپنے دیرینہ سوالات کے جوابات پا کر خوشگوار حیرت میں مبتلا رہی۔ جب تک میں وہاں نوکری کرتا رہا وہ اپنے عیسائی دوستوں کے ساتھ مل کر میرے عیسائی ہو جانے کی دعا مانگتا رہا اور میں اللہ سے اس کی ہدایت کا طلب گار رہا۔ الحمدللہ! مجھے اطمینان ہے کہ اس تک دین کا پیغام الہامی دلائل اور ثبوتوں کے ساتھ پہنچ گیا۔ اب ماننا نہ ماننا اس کا اپنا عمل ہو گا۔"

وحدت الوجود اور وحدت الشہود کو ماننے والے صوفیاء حضرات اسی قسم کی غلطی میں مبتلا ہیں کہ جس میں یہ عیسائی مبلغ

مبتلا ہے۔ اگر یہ اتنی ہی بڑی حقیقت تھی تو اس بارے قرآن مجید کی کوئی ایک تو صریح آیت موجود ہوتی۔ اور اگر اس بارے قرآن مجید کی کوئی ایک بھی صریح آیت موجود ہوتی تو یہ صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین، تبع تابعین، ائمہ دین اور محدثین عظام رحمۃ اللہ علیہم کا سرفہرست عقیدہ ہوتا۔

تزکیہ نفس اور لطائف

صوفیاء کے نزدیک اصلاح نفس میں لطائف کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ صوفیاء کی اصطلاح میں لطائف سے مراد روح انسانی کے اعضائے رئیسہ (major parts) ہیں۔ اور آسان الفاظ میں ان کے نزدیک انسانی بدن میں کچھ مقامات ایسے ہیں کہ جو انوار کا محل اور مقام ہیں اور انہیں اذکار کے ذریعے روشن کیا جاتا ہے۔ نقشبندیہ میں عموماً چھ لطائف معروف ہیں۔ قلب، روح، سر، خفی، اخفی اور نفس۔[1] بعض نے سلطان الاذکار کو بھی شامل کرتے ہوئے سات بیان کیے ہیں۔[2] بعض نے ان کی تعداد پانچ یا دس بھی بیان کی ہے جبکہ بعضوں کے نزدیک ان کی تعداد تیس سے اوپر ہے۔

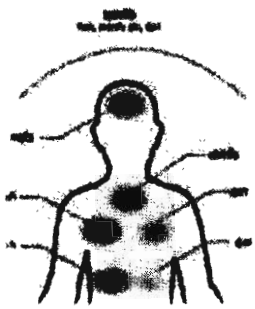

نقشبندیہ میں لطائف ستہ میں سے ایک کا مقام دل، دوسرا دل سے کچھ اوپر، تیسرا دل کے سامنے دائیں جانب، چوتھا دل کے سامنے سے کچھ اوپر، اور پانچواں ان دونوں کے اوپر درمیان میں اور چھٹا پیشانی میں ہے۔ درج ذیل تصویر نقشبندیہ کے نزدیک انسانی بدن میں لطائف ستہ کے مقامات کو بیان کر رہی ہے۔ چشتیہ نے بھی ان کی تعداد چھ ہی بیان کی ہے لیکن تین لطائف کے مقامات میں اختلاف کیا ہے۔ انہوں نے معدے، ناف اور دماغ کو بھی اس میں شامل کیا ہے۔

کیا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی لطائف پر توجہ کروائی یا ان کے لطائف روشن کروائے؟ اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔ صرف صحابہ ہی نہیں بلکہ تابعین، تبع تابعین اور فقہائے محدثین کے زمانے میں بھی لطائف کا کوئی تصور موجود نہیں تھا بلکہ صوفیاء میں معروف رائے کے مطابق حضرت بہاؤ الدین رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 791ھ) سے پہلے تصوف کی تاریخ میں لطائف کا تصور موجود نہیں تھا۔

صوفیاء کے اس تصورِ لطائف میں ایک چیز قابل توجہ ہے اور وہ لطیفہ قلب ہے۔ بلاشبہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بیسیوں روایات ایسی ہیں جو اس مقام یا عضو کی اصلاح اور اس پر توجہ کے بارے میں مروی ہیں جیسا کہ ایک روایت

---

[1] ذوقی، سید محمد شاہ، سر دلبراں: ص356، الفیصل ناشران، لاہور، 2005

[2] محمد اکرم اعوان، لطائف اور تزکیہ نفس: ص2، دار العرفان، چکوال

میں اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب دل صالح ہو جاتا ہے تو انسان کا سارا جسم صالح ہو جاتا ہے اور اگر اس میں فساد ہو جائے تو سارا جسم فساد والا ہو جاتا ہے۔[1] لہٰذا قلب کو توجہ کا مرکز بنانا اور اسے اللہ کی طرف متوجہ رکھنے کی کوشش کرنا، یہ بات درست معلوم ہوتی ہے۔

لطائف کو روشن کرنے کا ایک طریقہ تو صوفیاء نے متعارف کروایا کہ جس سے ہمیں اتفاق نہیں ہے کہ جس میں مراقبہ، ذکر جہری، پاس انفاس، ذکر خفی اور ضرب قلب جیسے ذرائع سے لطائف روشن کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور یہ سب ذرائع اس معنی میں غیر مسنون ہیں کہ خیر القرون میں ان پر عمل نہیں تھا، لیکن اس کے برعکس ان سات لطائف یعنی قلب، ذہن، زبان، آنکھیں، کان، معدہ اور ناف کو ہم فرائض کی پابندی اور نوافل پر دوام کی صورت میں روشن کرنے کی بات کریں تو یہ مسنون ذریعہ ہے۔ لطیفہ قلب کی روشنی تو یاد الٰہی میں ہے اور لطیفہ زبان کے روشن کرنے سے مراد آفات سے اس کی حفاظت اور ذکر الٰہی سے رطب اللسان رکھنا ہے۔ لطیفہ دماغ اس وقت روشن ہو گا جبکہ خالص توحید کا حامل ہو اور ہر قسم کے شرکیہ اور کفریہ افکار و نظریات سے پاک ہو۔ لطیفہ سماعت اور بصارت کا روشن ہونا بھی ان کے شریعت کے مطابق استعمال کے بقدر ہے۔ لطیفہ معدہ کی روشنی حرام سے اجتناب اور لطیفہ ناف کی روشنی ہر قسم کی شہوات سے اجتناب سے حاصل ہوتی ہے۔ من جملہ اگر انسان شریعت اسلامیہ پر عمل کرے اور دل کو اللہ کی طرف متوجہ رکھنے کے لیے، زبان و دماغ کے ساتھ، دوام ذکر و فکر الٰہی کی عادت ڈالے تو اس کے جمیع لطائف روشن ہو جائیں گے۔

شیخ الکل فی الکل علامہ نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 1320ھ) کا کہنا ہے کہ صلوات خمسہ یعنی پانچ نمازیں ہی لطائف خمسہ ہیں اور قرآن مجید سلطان الاذکار ہے۔ بعض صوفیاء چونکہ سلطان الاذکار کو الگ سے لطیفہ شمار نہیں کرتے لہٰذا شیخ الکل نے بھی لطائف کی تعداد پانچ بیان کرتے ہوئے چھٹے لطیفے یا سلطان الاذکار سے مراد قرآن مجید لیا ہے۔ یہ لطائف کی سلفی تعبیر ہے یعنی جس نے اپنے پانچ لطائف روشن کرنے ہوں وہ اپنی نمازوں کو بہتر سے بہتر بنائے یہاں تک کہ انہیں درجہ احسان تک لے آئے اور جس نے سلطان الاذکار کو روشن کرنا ہو تو وہ قرآن مجید کی تلاوت کو بہتر کرے یہاں تک کہ حدیث کے الفاظ کے مطابق "أهل الله" میں اور "أصحاب القرآن" میں شامل ہو جائے۔[2] نمازوں کے لطائف سے انسان کا باطن اس قدر روشن ہو گا کہ اس کا یہ نور قیامت والے دن

---

[1] «أَلاَ وَإِنَّ فِي الجَسَدِ مُضْغَةً: إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الجَسَدُ كُلُّهُ، وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الجَسَدُ كُلُّهُ، أَلاَ وَهِيَ القَلْبُ» (صحيح البخاري، كِتَابُ الإِيمَانِ، بَابُ فَضْلِ مَنِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ: 52)

[2] القزويني، أبو عبد الله محمد بن يزيد، سنن ابن ماجة، افتتح الكتاب في الإيمان وفضائل الصحابة والعلم، باب فضل من تعلم القرآن وعلمه: 215، قال الألباني هذا الحديث صحيح، دار السلام للنشر والتوزيع، الرياض، الطبعة الأولى، 1999م

بھی باقی رہے گا۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

عَنْ بُرَيْدَةَ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ: «بَشِّرِ الْمَشَّائِينَ فِي الظُّلَمِ إِلَى الْمَسَاجِدِ بِالنُّورِ التَّامِّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»[1]

"سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو لوگ اندھیروں میں کثرت سے مسجد کا رخ کرتے ہیں، انہیں قیامت کے دن مکمل نور کی خوش خبری دے دو۔"

حدیث کی روشنی میں لطائف آٹھ ہیں کہ جن میں چار انسانی جسم میں ہیں اور چار اس کے جسم سے باہر ہیں۔ اور یہ دو کاموں سے روشن ہوتے ہیں، ایک فجر کی نماز باجماعت ادا کرنے سے اور دوسرا ان کے روشن ہونے کی دعا مانگنے سے۔ اللہ کے رسول ﷺ فجر کی نماز کے لیے مسجد جاتے ہوئے یا فجر کی نماز میں یہ دعا مانگا کرتے تھے:

«اللَّهُمَّ اجْعَلْ فِي قَلْبِي نُورًا، وَاجْعَلْ فِي لِسَانِي نُورًا، وَاجْعَلْ فِي سَمْعِي نُورًا، وَاجْعَلْ فِي بَصَرِي نُورًا، وَاجْعَلْ خَلْفِي نُورًا، وَأَمَامِي نُورًا، وَاجْعَلْ مِنْ فَوْقِي نُورًا، وَمِنْ تَحْتِي نُورًا اللَّهُمَّ، وَأَعْظِمْ لِي نُورًا»[2]

"اے اللہ! میرے دل کو نور سے بھر دے اور میری زبان میں نور رکھ دے۔ اور میری سماعت میں نور فرمادے اور میری بصارت کو نور بنادے۔ اے اللہ! میرے آگے نور فرمادے، پیچھے نور فرمادے، اوپر نور فرمادے اور نیچے نور فرمادے۔ اے اللہ! میرے نور کو بڑھادے۔"

قوائے ثلاثہ

علما کا کہنا ہے کہ اللہ عزوجل نے ہر انسان میں تین قوتیں رکھی ہیں: عقل کی قوت، غضب کی قوت اور شہوت کی قوت۔ ان تینوں قوتوں میں افراط و تفریط یعنی زیادتی اور کمی (extremes) ظلم ہے جبکہ اعتدال یعنی میانہ روی مطلوب ہے۔

عقل کی قوت ایسی قوت ہے کہ جس کے ذریعے انسان غور و فکر کرتا ہے۔ عقل کی قوت میں تفریط اور کمی یہ ہے کہ جہاں اسے استعمال کرنا چاہیے وہاں ہم اسے استعمال نہ کریں۔ اور اس سے کند ذہنی اور حماقت (stupidity) جنم لیتی ہے۔ اور عقل کی قوت میں افراط اور زیادتی یہ ہے کہ ہم اِس کا وہاں بھی استعمال کریں جہاں اس کا استعمال کرنا بے معنی اور لایعنی ہو اور اسے سوفسطائیت (sophistry) کہتے ہیں۔ اور اگر عقل کی قوت

---

[1] السجستاني، سليمان بن الأشعث، سنن أبي داود، كِتَاب الصَّلَاةِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي الْمَشْيِ إِلَى الصَّلَاةِ فِي الظَّلَامِ: 561، قال الألباني هذا الحديث صحيح، دار السلام للنشر والتوزيع، الرياض، الطبعة الأولى، 1999م

[2] سنن أبي داود، أَبْوَابُ قِيَامِ اللَّيْلِ، بَابٌ فِي صَلَاةِ اللَّيْلِ: 1353، قال الألباني في هذا الحديث صحيح

میں اعتدال ہو تو اسے حکمت (wisdom) کہتے ہیں جو کہ مطلوب ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝﴾[1]

"اللہ عزوجل جس کو چاہتے ہیں، حکمت عطا فرماتے ہیں۔ اور جسے حکمت جیسی نعمت دی گئی تو اسے تو بہت زیادہ خیر دے دیا گیا۔ اور اِس بات سے صرف وہی نصیحت حاصل کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔"

غضب کی قوت میں اگر تفریط اور کمی ہو تو اسے بزدلی کہتے ہیں اور اگر افراط اور زیادتی ہو تو اسے رعونت کہتے ہیں اور اگر اعتدال ہو تو اسے شجاعت کہتے ہیں جو کہ مطلوب ہے۔ بس اگر کسی کو غصہ نہ آئے تو وہ بزدل ہے بلکہ بے غیرت ہے اور غصہ کا نہ آنا کوئی شریعت کا مطالبہ نہیں ہے۔ اور جسے بلاوجہ غصہ آئے اور ایسی جگہ غصہ کھائے جہاں غصہ نہیں کھانا چاہیے تھا تو یہ رعونت ہے۔ اور جو اللہ کے دین کے لیے غصہ کرتا ہے اور اپنے نفس کے لیے غصہ پی جاتا ہے تو یہ اعتدال ہے اور اسی کا نام شجاعت ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«وَاللهِ مَا انْتَقَمَ لِنَفْسِهِ فِي شَيْءٍ يُؤْتَى إِلَيْهِ قَطُّ، حَتَّى تُنْتَهَكَ حُرُمَاتُ اللهِ، فَيَنْتَقِمُ للهِ»[2]

"اللہ کی قسم! اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کے لیے کبھی بھی کسی سے انتقام نہیں لیا۔ البتہ اگر اللہ کی حدود میں سے کسی حد کی حرمت پامال کی جاتی تو آپ اللہ کے لیے انتقام لیتے تھے۔"

بعض اوقات انسان غصہ اپنے نفس کے لیے کر رہا ہوتا ہے لیکن نام دین کا لیتا ہے، یہ بھی غلط ہے بلکہ زیادہ خطرناک ہے۔ غضب کی قوت سے صرف غصہ نہیں پیدا ہوتا بلکہ بغض، نفرت، عداوت اور رعونت وغیرہ جیسے کئی قسم کے رذائل پیدا ہوتے ہیں۔

شہوت کی قوت میں اگر تفریط اور کمی ہو تو یہ سستی ہے بلکہ مردانگی کے خلاف ہے۔ اور اگر شہوت کی قوت میں افراط اور زیادتی ہو تو ہوس ہے اور اگر اس میں اعتدال ہو تو یہ عفت ہے اور یہی دین میں مطلوب ہے۔ یعنی ہمارا دین نہ تو ہم سے یہ چاہتا ہے کہ ہم اپنی شہوت کی قوت کو دبا دیں یا اسے جڑ سے ہی ختم کر دیں۔ ان دونوں صورتوں کا نتیجہ نسل انسانی کا خاتمہ ہے جو کہ فطرت کے خلاف ہے۔ اِسی طرح ہمارے دین کا یہ بھی تقاضا نہیں ہے کہ ہم اپنی شہوت کو بے لگام چھوڑ دیں کہ حلال و حرام کی پرواہ نہ رہے۔ اور اگر شہوت کی قوت کو حلال میں استعمال کیا جائے جیسا کہ نکاح وغیرہ میں اور حرام سے بچایا جائے تو اسے عفت کہتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآئِكُمْ ۚ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ وَ لْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۗ﴾[3]

---

[1] سورة البقرة:2: 269

[2] صحيح البخاري، كتاب الحدود، بَابُ إِقَامَةِ الحُدُودِ وَالِانْتِقَامِ لِحُرُمَاتِ الله: 6786

[3] سورة النور:24: 32-33

"اور تم میں سے جو مرد اور عورتیں بغیر نکاح کے ہیں، ان کے نکاح کروادو۔ اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں میں سے نیکوکاروں کا بھی نکاح کروادو۔ اور اگر وہ غریب ہوں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں اپنے فضل سے مالدار کردے گا۔ اور اللہ تعالیٰ فراخی دینے والا اور جاننے والا ہے۔ اور جو لوگ نکاح کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے تو انہیں چاہیے کہ وہ عفت اختیار کریں یہاں تک کہ اللہ عزوجل انہیں اپنے فضل سے غنی کردے۔"

شہوت کی قوت سے صرف شہوت ہی پیدا نہیں ہوتی بلکہ لالچ، حرص، طمع اور ہوس وغیرہ جیسے کئی قسم کے رذائل بھی پیدا ہوتے ہیں۔ پس اسلام کا مقصود اُن قوتوں کا خاتمہ نہیں ہے کہ جن کی افراط و تفریط سے نفس میں رذائل پیدا ہوتے ہیں بلکہ ان قوتوں کو قابو کرنا اور اعتدال کے ساتھ ان کا استعمال ہمارے دین کی تعلیم ہے۔ جسم انسانی میں ان تین قوتوں اور جبلتوں کی مثال تین جنریٹروں (generators) کی سی ہے۔ اگر تو تزکیہ نفس کے عمل میں ان تین جبلتوں (inborn characters) کو کمزور کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اس سے تفریط پیدا ہو گی جو اسلام میں مطلوب نہیں ہے۔ اور دوسری صورت لاپرواہی اور غفلت سے ان جبلتوں کو قوی کرنا یعنی افراط ہے اور یہ بھی مطلوب نہیں ہے۔ پس اخلاق حسنہ ہوں یا رذائل (vices) دونوں انہی جبلتوں اور قوتوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر یہ جبلتیں یعنی عقل، غضب اور شہوت اعتدال میں ہوں تو اخلاق حسنہ پیدا ہوتے ہیں اور اگر یہ افراط و تفریط میں ہوں تو رذائل پیدا ہوتے ہیں۔ پس یہ قوتیں اخلاق اور رذائل کی جنریٹر ہیں لہذا ان کی تربیت ضروری ہے اور ان کی تربیت کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ اعتدال میں رہیں۔ واللہ اعلم

ایک اور بات یہ بھی ذہن میں آتی ہے کہ ہمیں وہ اسباب بھی اختیار نہیں کرنے چاہییں جو ان جبلتوں میں افراط و تفریط کا باعث بنیں۔ مثلاً ضرورت سے کم کھانا انسان میں شہوت کی جبلت کو تفریط میں لے جانے کا سبب بنتا ہے اور ضرورت سے زائد کھانا انسان میں شہوت کی قوت میں افراط کا باعث ہے لہذا نہ تو ضرورت سے کم کھانا تقوی ہے اور نہ ہی ضرورت سے زائد کھانا نیکی ہے بلکہ کھانے میں اعتدال ہونا چاہیے تاکہ شہوت کی قوت میں بھی اعتدال رہے۔ واللہ اعلم

بعض علما کا کہنا ہے کہ شہوت کی قوت اس لیے رکھی گئی کہ انسان اس کے ذریعے اپنے نفس کے واسطے نفع بخش چیزیں حاصل کرے۔ اور غضب کی قوت کا مقصد یہ ہے کہ انسان اس کے ذریعے اپنی ذات سے ضرر رساں چیزوں کو دور کرے۔ اور عقل کی قوت کا مقصد یہ ہے کہ وہ نفس کے لیے نفع بخش اور ضرر رساں چیزوں میں فرق کرے۔ پس یہ تینوں قوتیں در اصل انسان کے فائدے کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ پس اس قول کے درست ہونے کی صورت میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ نفس انسانی کی وہ تین جہات ہیں کہ جن سے جمیع اخلاق اور رذائل پیدا ہوتے ہیں۔

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اگر انسان میں دنیا، مال اور جاہ کی طلب (desire) پیدا ہو تو یہ شہوت کی قوت کی وجہ سے ہے۔ اگر یہ طلب اعتدال میں رہے تو یہی مطلوب ہے اور اگر شدید ہو جائے تو اسے حرص، لالچ اور طمع کہتے

ہیں جو آزمائش بن جاتی ہے۔ اگر انسان شدید طلب کے بعد دنیا، مال اور جاہ حاصل کر لے تو اس سے بخل اور کنجوسی پیدا ہوتی ہے اور اگر معتدل طلب کے بعد یہ چیزیں حاصل ہوں گی تو بخل اور کنجوسی پیدا نہ ہو گی۔ اور اگر ایسا ہو کہ طلب تو شدید ہو لیکن انسان کو دنیا، مال اور جاہ حاصل کرنا مشکل ہو یہاں تک کہ اسے ان کے حصول کے لیے اپنی قوت غضب استعمال کرنی پڑے تو اس سے فخر، تکبر، ظلم اور عداوت پیدا ہوتی ہے۔ واللہ اعلم

اور اگر انسان اپنے آپ سے کسی ضرر رساں چیز کو دور کرنا چاہے تو اس کے لیے قوت غضب کو استعمال کرتا ہے مثلاً کسی نے اسے گالم گلوچ کی اور اب وہ اس لعن طعن کو اپنے سے دور کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے غضب کی قوت کو استعمال کرے گا۔ اگر وہ اس ضرر رساں چیز کو اپنے سے دور نہ کر سکے تو اس سے بغض پیدا ہوتا ہے اور اگر انسان کسی اور کو دیکھے کہ وہ تو اپنے نفس سے ضرر کو دور کرنے اور فائدہ پہنچانے کی قدرت رکھتا ہے لیکن وہ خود اس اہل نہیں ہے تو اس سے حسد پیدا ہوتا ہے۔ یہ بات بھی ذہن میں آتی ہے کہ جذبہ انتقام بھی قوت غضب کے افراط سے پیدا ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

فناء اور بقاء

صوفیاء نے تزکیہ نفس میں فناء اور بقاء کی اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ متقدمین صوفیاء کا تصور فناء و بقاء سادہ تھا۔ فناء سے ان کی مراد رذائل نفس سے اپنی ذات کو پاک کرنا اور بقاء سے مراد اخلاق حمیدہ سے اپنے نفس کو متصف کرنا تھا۔ فناء کی اصطلاح رذائل کے لیے تھی اور بقاء کی اخلاق عالیہ کے لیے۔ شیخ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارے گفتگو کرتے ہوئے اپنے زمانے کے ان صوفیوں کو جاہل قرار دیا ہے کہ جو "فنائے کلی" کا بدعی تصور رکھتے ہیں۔[1]

متاخرین صوفیاء میں ایک ایسی جماعت پیدا ہوئی کہ جنہوں نے تصوف کو عمل سے زیادہ نظریہ بنا دیا۔ انہوں نے فنا فی اللہ اور بقا باللہ کو سالک کی منازل قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک فنا فی اللہ عروج ہے اور بقا باللہ زوال ہے۔ پس سالک اپنے تزکیہ نفس میں اپنے قلب و ذہن کو اللہ کے غیر سے اس طرح پاک کر لے کہ اللہ کا غیر، سالک کے ہاں درجہ علم میں نہ رہے۔ اور سالک کو خالق کے علاوہ کچھ محسوس نہ ہو۔ ایسا سالک اپنے آپ کو اللہ کی ذات میں فنا کر دیتا ہے بایں معنی کہ اس پر اللہ کے تصور اور محبت کا اس قدر غلبہ ہوتا ہے کہ غیر کا وجود اس کے دل و دماغ میں باقی نہیں رہتا۔ فنا فی اللہ کے بعد بعض سالکین کو بقا باللہ کا مرتبہ دیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ سالک اپنے دل و دماغ کو جب اللہ کی ذات میں فنا کر دیتا تو مخلوق اس کے لیے ایک اعتبار سے معدوم ہو گئی ہے۔ اب اللہ کی طرف سے تبلیغ و دعوت یا کسی دوسری مصلحت کے سبب سے سالک کو دوبارہ مخلوق کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے اور

[1] الجلابی الغزنوی الہجویری، علی بن عثمان بن ابی علی، کشف المحجوب، مترجم فضل دین گوہر: ص227-230، مزدور پرنٹنگ پریس، لاہور، 1972ء

وہ اللہ کے تصور کے ساتھ غیر کا تصور اپنے ذہن میں اور اللہ کی محبت کے ساتھ مخلوق کی محبت بھی اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔ اس طرح مخلوق جو کہ فنا فی اللہ میں سالک کے لیے معدوم ہو چکی تھی، اگرچہ حقیقت میں وہ موجود تھی، تو بقا باللہ میں وہ مخلوق دوبارہ سالک کے قلب و ذہن میں آموجود ہوتی ہے۔[1]

ہمیں فنا و بقا کی ان دونوں تعبیرات سے دلچسپی نہیں ہے۔ پہلی تعبیر اگرچہ اپنے مقصود میں تو شرعی ہے یعنی رذائل کا خاتمہ اور اخلاق عالیہ سے متصف ہونا لیکن یہ تعبیر فنا اور بقا کے الفاظ کا دور کا معنی معلوم ہوتا ہے۔ اور فنا و بقا کی دوسری تعبیر تو شرعی اعتبار سے بھی مطلوب نہیں ہے کیونکہ اس تعبیر کو مان لینے کی صورت میں فنا فی اللہ کا عروج استغراق (self-absorption) اور سکر (senselessness) قرار پاتا ہے جو شرعی اعتبار سے مطلوب صفات نہیں ہیں۔ استغراق اگر مطلوب ہوتا تو اللہ کے رسول ﷺ جماعت کی نماز میں بچے کے رونے کی آواز سن کر نماز مختصر نہ کرتے۔ عین نماز کی حالت میں بھی نبی کریم ﷺ اللہ کی طرف بھی کامل درجے میں متوجہ رہتے تھے اور اپنی امت سے بھی غافل نہ تھے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«إِنِّي لَأَقُومُ فِي الصَّلَاةِ أُرِيدُ أَنْ أُطَوِّلَ فِيهَا، فَأَسْمَعُ بُكَاءَ الصَّبِيِّ، فَأَتَجَوَّزُ فِي صَلَاتِي كَرَاهِيَةَ أَنْ أَشُقَّ عَلَى أُمِّهِ»[2]

"میں نماز پڑھانے کے لیے کھڑا ہوتا ہوں اور میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنی نماز لمبی کروں۔ پس اسی دوران مجھے کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دیتی ہے تو میں اپنی نماز مختصر کر دیتا ہوں تاکہ اُس کی ماں زیادہ دیر تکلیف میں نہ رہے۔"

اور امام ابن قیم رحمہ اللہ نے درست کہا کہ اس تعبیر کو مان لینے کی صورت میں مقام فنا میں جب سالک ﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ ﴾[3] کی تلاوت نماز میں کرے گا تو کس ذہنی شعور کے ساتھ اپنی عبدیت کا اقرار کر پائے گا؟[4]

اگر ہم کتاب و سنت سے فنا و بقا کا تصور لیں تو وہ اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے کہ فنا و بقا سے مراد اللہ کے قرب کے شوق میں اپنی جان کو قربان کر دینا ہے۔ اللہ کے راستے میں جان دے دینا، جسے ہم شہادت کہتے ہیں، سے بڑھ کر انسان کیا مرتبہ فنا حاصل کرے گا؟ اور اس فنا یا شہادت کے بعد اللہ کے عرش کے نیچے قندیلوں میں رات گزارنے سے بڑھ کر بقا باللہ کا کیا تصور ہمارے قلب و ذہن میں آ سکتا ہے کہ جسے کتاب و سنت کی تصدیق بھی

---

[1] شریعت و طریقت: ص307

[2] صحيح البخاري، كتاب الآذان، بَابُ مَنْ أَخَفَّ الصَّلاَةَ عِنْدَ بُكَاءِ الصَّبِيِّ: 707

[3] سورة الفاتحه: 1:4

[4] مدارج السالكين: 1/ 171

حاصل ہو۔ شہید دراصل مقام فنا سے گزر کر بقا کا ایسا مقام حاصل کر لیتا ہے کہ جس کو پھر زوال نہیں ہے۔ اور یہاں فنا زوال ہے اور بقا عروج ہے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴾[1]

"اور تم ان لوگوں کو مردہ خیال مت کرو جو اللہ کے راستے میں مارے گئے بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کے ہاں رزق دیے جاتے ہیں۔"

جبکہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

«أَرْوَاحُ الشُّهَدَاءِ عِنْدَ اللهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِي حَوَاصِلِ طَيْرٍ خُضْرٍ، لَهَا قَنَادِيلُ مُعَلَّقَةٌ بِالْعَرْشِ، تَسْرَحُ فِي أَيِّ الْجَنَّةِ شَاءُوا، ثُمَّ تَرْجِعُ إِلَى قَنَادِيلِهَا فَيُشْرِفُ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ فَيَقُولُ: أَلَكُمْ حَاجَةٌ؟ تُرِيدُونَ شَيْئًا؟ فَيَقُولُونَ: لَا، إِلَّا أَنْ نَرْجِعَ إِلَى الدُّنْيَا فَنُقْتَلَ مَرَّةً أُخْرَى»[2]

"شہداء کی ارواح قیامت کے دن تک اللہ کے پاس رہتی ہیں اور انہیں سبز پرندوں کے پیٹوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اُن کی رہائش کے لیے عرش کے ساتھ لٹکی ہوئی قندیلیں ہیں۔ یہ ارواح جنت میں جہاں چاہتی ہیں، چرتی چگتی ہیں اور پھر شام کو عرش کے نیچے اپنی قندیلوں میں واپس آ جاتی ہیں۔ پس اُن کا رب اُنہیں جھانک کر دیکھتا ہے اور اُن سے پوچھتا ہے کہ تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہے، کچھ چاہیے؟ تو وہ کہتی ہیں: نہیں، کچھ نہیں چاہیے سوائے اس کے کہ ہم دنیا میں ایک بار دوبارہ بھیجی جائیں اور ہمیں دوبارہ اُسی طرح قتل کیا جائے۔"

فنا و بقا کا یہ تصور انسان کے وجود میں سرمستی و سرشاری، امید و حیات اور اپنے رب پر بار بار نثار ہونے کی جو احوال اور کیفیات پیدا کر دیتا ہے، وہ کسی اور تصور سے پیدا ہونی ممکن ہیں کیا؟

سماع اور وجد

صوفیاء کے نزدیک سماع سے مراد غنائیہ اشعار کو آلات اور رقص کے ساتھ خوبصورت آواز کی صورت میں پیش کرنا ہے۔[3] مروجہ قوالی اور دھمال، سماع اور وجد ہی کی ارتقائی صورتیں ہیں۔ بعض صوفیاء کا کہنا ہے کہ سماع سے انسان کے دل میں چھپا ہوا شوق، وجد، ہیجان، رقت اور قلق بیدار ہو جاتا ہے اور اس طرح گویا سماع سے دل میں ایسی حرکت پیدا ہوتی ہے جو تقرب الی اللہ کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ سلاسل میں سے نقشبندیہ سماع سے اجتناب

---

[1] سورة آل عمران: 3: 169

[2] الدارمي، عبد الله بن عبد الرحمن ، مسند الدارمي، كتاب الجهاد، باب أرواح الشهداء: 2454، قال حسين أسد الداراني إسناده صحيح، دار المغني للنشر والتوزيع، المملكة العربية السعودية، الطبعة الأولى، 2000ء

[3] الغزالي، أبو حامد محمد بن محمد، إحياء علوم الدين: 2/ 268-306، دار المعرفة، بيروت

جبکہ چشتیہ اس کے جواز کے قائل ہیں۔[1]

ائمہ اربعہ اور محدثین عظام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آلات موسیقی حرام ہیں۔[2] اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیا نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سماع، وجد اور رقص کو تقرب اور تزکیہ کا ذریعہ بنایا؟ تو اس کا جواب نفی میں ہے۔ کیا ہم نبی کریم ﷺ یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے یہ تصور بھی کر سکتے ہیں کہ وہ قوالی سنتے اور دھمال ڈالتے ہوں گے؟ نہیں، ہر گز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام شافعی (متوفیٰ 204ھ) ، امام احمد بن حنبل (متوفیٰ 241ھ) ، قاضی ابو الطیب الشافعی (متوفیٰ 450ھ)، امام قرطبی المالکی (متوفیٰ 1273ھ)، امام طرطوشی المالکی (متوفیٰ 1126ھ)، امام الشاطبی المالکی (متوفیٰ 1388ھ)، امام ابن الصلاح الشافعی (متوفیٰ 1245ھ)، امام ابن تیمیہ الحنبلی (متوفیٰ 728ھ) امام ابن القیم الحنبلی (متوفیٰ 751ھ) رحمۃ اللہ علیہم نے صوفیاء کے سماع اور رقص کو بدعت قرار دیا ہے۔ حنفی فقیہ ابن نجیم مصری رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 970ھ) لکھتے ہیں:

وَعَنْ قَيْسِ بْنِ عُبَادَةَ قَالَ كَانَ أَصْحَابُ رَسُولِ اللهِ ﷺ يَكْرَهُونَ الصَّوْتَ عِنْدَ ثَلَاثٍ: الْجَنَائِزُ، وَالْقِتَالُ، وَالذِّكْرُ، وَالْمُرَادُ بِالذِّكْرِ الْوَعْظُ وَقَالَ الْإِمَامُ شَمْسُ الْأَئِمَّةِ السَّرَخْسِيُّ فَفِي هَذَا الْحَدِيثِ بَيَانُ كَرَاهَةِ رَفْعِ الصَّوْتِ عِنْدَ سَمَاعِ الْقُرْآنِ، وَالْوَعْظِ فَتَبَيَّنَ بِهِ أَنَّ مَا يَفْعَلُهُ الَّذِينَ يَدَّعُونَ الْوَجْدَ، وَالْمَحَبَّةَ مَكْرُوهٌ وَلَا أَصْلَ لَهُ فِي الدِّينِ وَتَبَيَّنَ بِهِ أَنَّهُ يُمْنَعُ الْمُتَقَشِّفَةُ وَحَمْقَى أَهْلِ التَّصَوُّفِ مِمَّا يَعْتَادُونَهُ مِنْ رَفْعِ الصَّوْتِ وَتَمْزِيقِ الثِّيَابِ عِنْدَ السَّمَاعِ، لِأَنَّ ذَلِكَ مَكْرُوهٌ فِي الدِّينِ عِنْدَ سَمَاعِ الْقُرْآنِ، وَالْوَعْظِ فَمَا ظَنُّكَ عِنْدَ سَمَاعِ الْغِنَاءِ.[3]

"سیدنا قیس بن عبادۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ تین مقامات پر آواز بلند کرنے کو ناپسند جانتے تھے: جنازے کے وقت، لڑائی کے وقت اور ذکر کرتے وقت کہ جس سے مراد وعظ ہے۔ شمس الائمہ امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 1090ھ) کا کہنا ہے کہ یہ روایت اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن اور وعظ سنتے وقت بلند آواز نکالنا مکروہ ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ جسے یہ (صوفیاء) وجد اور محبت کا نام دے کر کرتے ہیں، وہ بھی مکروہ ہے۔ اور دین میں اس کی کوئی بنیاد موجود نہیں ہے۔ اور اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ اہل تصوف میں موجود اس قسم کے زاہدوں اور احمقوں کو سماع کے وقت آوازیں بلند کرنے اور کپڑے پھاڑنے سے منع کیا جائے کیونکہ یہ تو قرآن اور وعظ کے سماع کے وقت جائز نہیں ہے تو غنا کے سماع کے وقت کیسے جائز ہو گا؟"

---

[1] شریعت اور طریقت: ص295-296

[2] الألباني، محمد ناصر الدين، تحريم آلات الطرب: ص98-105، مؤسسة الريان، بيروت، الطبعة الثالثة، 2005ء

[3] ابن نجيم المصري، زين الدين بن إبراهيم، البحر الرائق شرح كنز الدقائق: 5/ 82، دار الكتاب الإسلامي

احادیث میں آلات موسیقی سے اجتناب کا حکم اس لیے بھی ہے کہ یہ انسان کو بے خودی اور مدہوشی کی ایسی کیفیت میں لے جاتے ہیں کہ اگر سامع کا رخ مخلوق کی طرف ہو تو شراب اور زنا جیسی منکرات میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اگر خالق کا قصد ہو تو وجد اور سکر میں مبتلا ہو کر شطحیات میں پڑ جاتا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«لَيَكُونَنَّ مِنْ أُمَّتِي أَقْوَامٌ، يَسْتَحِلُّونَ الحِرَ وَالحَرِيرَ، وَالخَمْرَ وَالمَعَازِفَ»[1]

"میری امت میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو زنا، ریشم، شراب اور آلات موسیقی کو حلال کر لیں گے۔"

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ نَافِعٍ، قَالَ: سَمِعَ ابْنُ عُمَرَ، مِزْمَارًا قَالَ: فَوَضَعَ إِصْبَعَيْهِ عَلَى أُذُنَيْهِ، وَنَأَى عَنِ الطَّرِيقِ، وَقَالَ لِي: يَا نَافِعُ هَلْ تَسْمَعُ شَيْئًا؟ قَالَ: فَقُلْتُ: لَا، قَالَ: فَرَفَعَ إِصْبَعَيْهِ مِنْ أُذُنَيْهِ، وَقَالَ: «كُنْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فَسَمِعَ مِثْلَ هَذَا فَصَنَعَ مِثْلَ هَذَا»[2]

"سیدنا نافع رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے مزمار کی آواز سنی تو اپنے دونوں کانوں میں اپنی انگلیاں ڈال لیں اور دوسرا راستہ اختیار کر لیا۔ اور مجھ سے پوچھا: کیا اب آواز آ رہی ہے؟ میں نے کہا: نہیں۔ تو انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں سے باہر نکال لیں اور کہا: میں اللہ کے نبی ﷺ کے ساتھ تھا کہ آپ کو ایسی ہی آواز سنائی دی تو آپ نے ایسا ہی کیا جیسا کہ میں نے کیا ہے۔"

رہی صوفیاء کی نیت، زمان، مکان اور اخوان کی شروط کے ساتھ سماع کے جواز کی بات تو ان شروط کے عدم جواز کے بارے عبد الرحمن بن عبد الرحیم القرشی کے مقالہ "السماع عند الصوفية: عرض ونقد على ضوء عقيدة أهل السنة والجماعة" کا مطالعہ مفید رہے گا۔

پس جائز سماع وہی ہے جو قرآن مجید کا ہے جیسا کہ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، أَنَّهُ قَالَ: «يَا أَبَا مُوسَى لَقَدْ أُعْطِيتَ مِزْمَارًا مِنْ مَزَامِيرِ آلِ دَاوُدَ»[3]

"اللہ کے نبی ﷺ نے ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ سے کہا: تجھے آل داؤد کے مزامیر میں سے ایک مزمار (sweet melodious voice) دیا گیا ہے۔"

---

[1] صحيح البخاري، كِتَابُ الأَشْرِبَةِ، بَابُ مَا جَاءَ فِيمَنْ يَسْتَحِلُّ الخَمْرَ وَيُسَمِّيهِ بِغَيْرِ اسْمِهِ: 5590

[2] سنن أبي داود، كِتَاب الْأَدَبِ، بَابُ كَرَاهِيَةِ الْغِنَاءِ وَالزَّمْرِ، المكتبة العصرية: 4924، قال الألباني، هذا الحديث صحيح

[3] الترمذي، أبو عيسى محمد بن عيسى، جامع الترمذي، أَبْوَابُ الْمَنَاقِبِ، بَابُ مَنَاقِبِ أَبِي مُوسَى الأَشْعَرِيِّ رَضِيَ الله عَنْهُ: 3855، قال الألباني هذا الحديث صحيح، دار السلام للنشر والتوزيع، الرياض، الطبعة الأولى، 1999م

یہی قرآن کا سماع ہے جو انسان کے دل میں وہ کیفیات اور احوال پیدا کرتا ہے جو تزکیہ اور تقرب کا ذریعہ بنتی ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّ عَلٰى رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ۝﴾[1]

"اور جب اُن پر قرآن مجید کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ آیات اُن کے ایمان میں اضافہ کر دیتی ہیں۔"

ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِذَا تُتْلٰى عَلَیْهِمْ اٰیٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ بُكِیًّا ۝﴾[2]

"اور جب اُن پر رحمن کی آیات کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ روتے ہوئے سجدے میں گر جاتے ہیں۔"

ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّمَا یُؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ هُمْ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ ۝﴾[3]

"ہماری آیات پر ایمان لانے والے لوگ تو صرف وہی ہیں کہ جنہیں اللہ کی آیات کے ذریعے نصیحت کی جائے تو سجدے میں گر جاتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح بیان کرتے ہیں اور تکبر نہیں کرتے۔"

صوفیاء کو سماع سے جو احوال نصیب ہوتے ہیں، ان میں سے "وجد" ان کے ہاں قیمتی ترین حال شمار ہوتا ہے۔ "وجد" سے مراد بے خودی اور مدہوشی کی وہ کیفیت ہے کہ جس میں انسان کو اپنے نفس پر قابو نہ رہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ بے خودی اور مستی کی یہ کیفیات اگر قرآن مجید سن کر طاری ہوں تو پھر بھی ہمارے دین میں مطلوب نہیں ہیں چہ جائیکہ سماع کے ناجائز ذریعے سے یہ احوال پیدا کیے جائیں۔ اللہ عزوجل کو اپنے بندوں سے جو احوال مطلوب ہیں، وہ وہی ہیں جو قرآن مجید میں بیان کر دیے گئے ہیں۔ جو احوال اللہ کے رسول ﷺ پر طاری نہ ہوئے ہوں تو وہ رحمان کے نہیں شیطان کے احوال ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِیْنُ جُلُوْدُهُمْ وَ قُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ﴾[4]

"اور قرآن مجید کو سن کر اُن لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔ پھر اُن کی کھالیں اور ان کے دل اللہ کے ذکر کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔"

معروف تابعی سیدنا قتادہ رحمۃ اللہ علیہ اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

هَذَا نَعْتُ أَوْلِيَاءِ اللهِ، نَعَتَهُمُ اللهُ بِأَنْ تَقْشَعِرَّ جُلُودُهُمْ، وَتَبْكِيَ أَعْيُنُهُمْ، وَتَطْمَئِنَّ قُلُوبُهُمْ إِلَى ذِكْرِ اللهِ،

---

[1] سورة الأنفال: 8: 2

[2] سورة مريم: 19: 58

[3] سورة السجدة: 32: 15

[4] سورة الزمر: 39: 33

وَلَمْ يَنْعَتْهُمْ بِذَهَابِ عُقُولِهِمْ وَالْغَشَيَانِ عَلَيْهِمْ، إِنَّمَا هَذَا فِي أَهْلِ الْبِدَعِ، وَهَذَا مِنَ الشَّيْطَانِ.[1]

"یہ اولیاء اللہ کی صفت ہے۔ اللہ نے اپنے اولیا کی یہ صفت بیان کی ہے کہ اللہ کی یاد میں اُن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اُن کی آنکھیں سے آنسو بہہ پڑتے ہیں اور اُن کے دل اللہ کی یاد سے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اور اللہ عزوجل نے اپنے اولیا کی یہ صفت بیان نہیں کی کہ اللہ کی یاد میں ان کی عقل رخصت ہو جاتی ہے یا وہ بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ اور یہ تو اہل بدعت کے احوال ہیں اور یہ شیطان کی طرف سے وارد ہوتے ہیں۔"

اسی طرح سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا:

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، أَنَّهُ سُئِلَ عَنِ الْقَوْمِ يُقْرَأُ عَلَيْهِمِ الْقُرْآنُ فَيَصْعَقُونَ. فَقَالَ: «ذَلِكَ فِعْلُ الْحَوَارِجِ»[2]

"کچھ لوگ جب قرآن مجید سنتے ہیں تو بے ہوش ہو کر گر جاتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ خوارج کی صفت ہے۔"

اسی طرح سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا ایک عراقی سے گزر ہوا جو کہ زمین پر گرا پڑا تھا اور لوگ اُس کے ارد گرد جمع تھے تو انہوں نے پوچھا:

«مَا هَذَا؟» فَقَالُوا: إِذَا قُرِئَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ أَوْ سَمِعَ اللَّهَ يُذْكَرُ خَرَّ مِنْ خَشْيَةِ اللهِ. فَقَالَ ابْنُ عُمَرَ: «وَاللهِ إِنَّا لَنَخْشَى اللهَ وَمَا نَسْقُطُ»[3]

"اسے کیا ہوا ہے۔ لوگوں نے جواب دیا کہ جب اس پر قرآن مجید کی تلاوت کی جاتی ہے یا وہ اللہ کا ذکر سنتا ہے تو خشیت الٰہی سے زمین پر گر پڑتا ہے تو ابن عمر رضی اللہ عنہ کہا: اللہ کی قسم، خشیت تو ہم پر بھی طاری ہوتی ہے لیکن ہم اس طرح زمین پر نہیں گرتے۔"

اسی طرح معروف تابعی سیدنا عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے:

عَنْ عِكْرِمَةَ، قَالَ: سُئِلَتْ أَسْمَاءُ هَلْ كَانَ أَحَدٌ مِنَ السَّلَفِ يُغْشَى عَلَيْهِ مِنَ الْخَوْفِ؟ فَقَالَتْ: «لَا، وَلَكِنَّهُمْ كَانُوا يَبْكُونَ»[4]

---

[1] ابن كثير، إسماعيل بن عمر القرشي، تفسير القرآن العظيم: 7/ 95، دار طيبة للنشر والتوزيع، الطبعة الثانية، 1420هـ

[2] البغدادي، القاسم بن سلاّم بن عبد الله الهروي، أبو عُبيد، فضائل القرآن: ص 215، دار ابن كثير، بيروت، الطبعة الأولى،1995م

[3] فضائل القرآن: ص 214

[4] أيضاً: ص 214

"سیدہ اسماء بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہا سے یہ پوچھا گیا کہ کیا سلف (صحابہ) میں سے کوئی ایسا تھا کہ جسے خوف خدا کی وجہ سے غشی کے دورے پڑتے ہوں تو انہوں نے کہا: نہیں، لیکن اُن کا خوف تو رونا تھا۔"

سیدنا ہشام بن حسان رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 147ھ) سے مروی ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا گیا:

عَنْ هِشَامِ بْنِ حَسَّانَ، قَالَ: قِيلَ لِعَائِشَةَ: إِنَّ قَوْمًا إِذَا سَمِعُوا الْقُرْآنَ صَعِقُوا. فَقَالَتْ: الْقُرْآنُ أَكْرَمُ أَنْ تَنْزِفَ عَنْهُ عُقُولُ الرِّجَالِ، وَلَكِنَّهُ كَمَا قَالَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ﴾.[1]

"کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جب قرآن مجید سنتے ہیں تو بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے کہا: قرآن مجید اس سے پاک ہے کہ اُسے سن کر لوگوں کی عقل جاتی رہی (یعنی عقل کا جاتے رہنا تو نقص ہے نہ کہ خوبی اور قرآن مجید کے استماع سے نقص تو پیدا ہونے سے رہا) لیکن جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے کہ جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں تو قرآن مجید سن کر اُن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔"

پس قرآن مجید کو خوبصورت آواز میں پڑھنا اور سننا یہی سماع ہے جو اہل ایمان سے مطلوب ہے۔ اور اس سماع سے پیدا ہونے والے احوال قرآنی احوال کہلاتے ہیں کہ جو عباد الرحمن کے احوال ہیں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

الْبَرَاءَ بْنَ عَازِبٍ، يُحَدِّثُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «زَيِّنُوا الْقُرْآنَ بِأَصْوَاتِكُمْ»[2]

"سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن مجید کو اپنی آوازوں سے خوبصورت کرو۔"

اور قرآن مجید کو خوبصورت طور پر پڑھنے سے مراد اس کو پڑھتے ہوئے منہ کے زاویے بنانے میں تکلف کرنا نہیں بلکہ لب و لہجے میں خشوع اور للّٰہیت کا ہونا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ جَابِرٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ مِنْ أَحْسَنِ النَّاسِ صَوْتًا بِالْقُرْآنِ، الَّذِي إِذَا سَمِعْتُمُوهُ يَقْرَأُ، حَسِبْتُمُوهُ يَخْشَى اللهَ»[3]

"سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بہترین آواز میں قرآن پڑھنے والا وہ ہے کہ جب تم

---

[1] أيضاً: ص 214-215

[2] سنن ابن ماجة، كِتَابُ إِقَامَةِ الصَّلَاةِ، وَالسُّنَّةُ فِيهَا، بَابٌ فِي حُسْنِ الصَّوْتِ بِالْقُرْآنِ: 1342، قال الألباني هذا الحديث صحيح

[3] سنن ابن ماجة، كِتَابُ إِقَامَةِ الصَّلَاةِ، وَالسُّنَّةُ فِيهَا، بَابٌ فِي حُسْنِ الصَّوْتِ بِالْقُرْآنِ: 1339، قال الألباني هذا الحدث صحيح

اسے قرآن پڑھتے سنو تو یہ محسوس کرو کہ وہ قرآن پڑھتے ہوئے اللہ سے ڈر رہا ہے۔"

اور عصر حاضر میں اللہ عزوجل نے بعض عرب قراء کو جن خوبصورت الحان میں قرآن مجید پڑھنے کی توفیق دی ہے، امر واقعہ یہ ہے کہ انہیں سن کر انسان میں بندگی کے احوال تازہ ہو جاتے ہیں۔ ماہر المعیقلی، سعد الغامدی، ادریس ابا بکر، الشریم، السدیس، مشاری راشد، صدیق المنشاوی، عبد الباسط وغیرہ جیسے کتنے نامور قاری ہیں کہ جن کی تلاوت انسانی روح میں نشاط کی عجب کیفیات پیدا کر دیتی ہے۔[1]

کبھی آپ تنہائی میں، اکیلے کمرے میں، ہلکی روشنی میں، مکمل خاموشی میں، اونچی آواز سے ماہر المعیقلی کی آواز میں قرآن مجید کا کچھ حصہ سن کر دیکھیں اور پھر اپنے آپ سے سوال کریں کہ کیا قرآن مجید سے بڑھ کر کوئی ذریعہ ایسا ہو سکتا ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم والی بندگی کے احوال زندہ کر دے؟ اور اگر آپ وہ دو چار رکوع کہ جن کی تلاوت آپ نے سننی ہو، ان کا ترجمہ بھی جانتے ہوں یا سننے سے پہلے ان کا لفظی ترجمہ ایک بار دیکھ لیں تو پھر آپ کو اصلاح نفس کے لیے قرآن مجید کے علاوہ کسی ذریعے کی طرف دیکھنے کی خواہش بھی محسوس نہ ہو گی۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ لِلَّهِ أَهْلِينَ مِنَ النَّاسِ» قَالُوا: يَا رَسُولَ اللهِ، مَنْ هُمْ؟ قَالَ: «هُمْ أَهْلُ الْقُرْآنِ، أَهْلُ اللهِ وَخَاصَّتُهُ»[2]

"سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے کہا: لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو اللہ کے لیے گھر والے ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: اللہ کے گھر والے کون ہو سکتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے کہا: قرآن سننے اور سنانے والے، اللہ کے گھر والے اور اس کے خاص لوگ ہیں۔"

علائق دنیا

اہل تصوف میں فکر و عمل کی جو بے اعتدالیاں پیدا ہوئیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انہوں نے انسانوں سے محبت کو اللہ سے محبت کے منافی سمجھا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ دنیا کی محبت کا معنی دنیا کی کسی شیء سے محبت ہو جانا ہے، چاہے وہ بیوی بچوں اور والدین ہی کیوں نہ ہوں۔ لہٰذا ان میں سے بعض نے اولاد سے محبت کو پسند نہیں کیا کہ یہ دنیا کی محبت ہے اور اللہ کی محبت میں رکاوٹ ہے۔ اس قسم کے خیالات عیسائی راہبوں اور بدھ بھکشوؤں میں بھی ملتے ہیں اور ان کا دین اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"اے عزیز سنو، مخدوم شیخ فرید شکر گنج سے نقل کیا گیا ہے کہ جب ان کے لڑکوں میں سے ایک لڑکے کا انتقال ہو

---

[1] ان قراء کی تلاوتیں درج ذیل ویب سائٹ سے ڈاؤن لوڈ کی جا سکتی ہیں۔ http://www.tvquran.com/en/

[2] سنن ابن ماجة، الكتاب في الإيمان وفضائل الصحابة والعلم، بَابُ فَضْلِ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ: 215، قال الألباني هذا الحديث صحيح

گیا اور اس کی موت کی خبر آپ کو پہنچائی گئی تو آپ پر رنج و غم سے متعلق کچھ تغیر نہ ہوا اور فرمایا سگ بچہ مر گیا ہے، اس کو باہر پھینک دو۔ اور جب سید البشر علیہ الصلوۃ والسلام کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو حضرت پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام اس قدر غمگین ہوئے کہ آنسو نکل آئے اور فرمایا: اے ابراہیم، ہم تیری جدائی کی وجہ سے بہت غمگین ہیں اور بڑے مبالغے اور تاکید کے ساتھ غم واندوہ کا اظہار فرمایا۔ فرمائیں کہ حضرت شکر گنج بہتر ہیں یا حضرت سید البشر علیہ الصلوۃ والسلام؟ عوام کالانعام کے نزدیک پہلا معاملہ بہتر ہے اور اس کو بے تعلق جانتے ہیں اور دوسرے کو عین تعلق اور اولاد سے لگاؤ خیال کرتے ہیں۔"[1]

گوتم بدھا (متوفی 400 قبل مسیح) نے اپنے غور و فکر کے نتیجے میں جو صداقتیں معلوم کیں اور ان کی روشنی میں اپنے مذہب بدھ مت کی بنیاد رکھی، ان میں سے ایک یہ تھی کہ دنیا میں دکھ ہی دکھ ہے۔ دوسری یہ تھی کہ دنیا کے دکھوں کا سبب دنیاوی اشیاء سے تعلق اور اس کی خواہش ہے کہ جب انسان کا کوئی دنیاوی تعلق ٹوٹ جاتا ہے یا اس کی کوئی خواہش پوری نہیں ہوتی تو اسے دکھ پہنچتا ہے۔ اور تیسری صداقت اس نے یہ معلوم کی کہ انسان اگر اپنے دکھ کا علاج کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ دنیا کی چیزوں سے ہر قسم کا تعلق ختم کر لے اور اپنی خواہشات کو مار دے۔ پس جب نہ تعلق (attachment) رہے گا اور نہ ہی خواہش (desire) تو تعلق کے ٹوٹنے اور کسی خواہش کے پورا نہ ہونے پر جو دکھ پہنچتا ہے، تو وہ کبھی نہ پہنچے گا۔

دین اسلام میں تعلقات اور خواہشات کو ختم کرنے کی بجائے، انسانی تعلقات کو اللہ کے تعلق کے تابع رکھنے اور خواہشات کو قابو میں رکھنے کا حکم ہے۔ مال و دولت، بیوی بچوں اور مقام و عہدے کی محبت تو خود اللہ تعالی نے انسان میں رکھی ہے اور مطالبہ یہ نہیں کیا کہ انہیں اپنے دل سے نکال باہر کرو بلکہ یہ کہا ہے کہ انہیں اللہ کی محبت کے تابع رکھو۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ ﴾[2]

"(اے نبی ﷺ) کہہ دیں کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے، اور تمہارے بھائی، اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں، اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے، اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا۔"

---

[1] مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی، دفتر اول، حصہ دوم، مکتوب 272، ص 320

[2] سورۃ التوبۃ: 9: 24

مبشرات

اللہ کے رسول ﷺ نے خواب میں بشارت کو نبوت کا چھیالیسواں حصہ قرار دیا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ خواب تین قسم کے ہوتے ہیں:

عَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ، عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ، قَالَ: «إِنَّ الرُّؤْيَا ثَلَاثٌ: مِنْهَا أَهَاوِيلُ مِنَ الشَّيْطَانِ لِيَحْزُنَ بِهَا ابْنَ آدَمَ، وَمِنْهَا مَا يَهُمُّ بِهِ الرَّجُلُ فِي يَقَظَتِهِ، فَيَرَاهُ فِي مَنَامِهِ، وَمِنْهَا جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَأَرْبَعِينَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ»[1]

"سیدنا عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ خواب تین قسم کے ہوتے ہیں: ایک وہ ہیں کہ جو شیطان کی طرف سے ڈراوا ہیں تا کہ وہ ان کے ذریعے انسان کو پریشان رکھے۔ دوسرے وہ خواب ہیں کہ جو کچھ ہم بیداری میں دیکھتے ہیں تو وہ خواب میں نظر آتا ہے۔ اور تیسرے وہ خواب ہیں جو نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہیں۔"

پس کچھ خواب اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں اور سچے خواب ہوتے ہیں لیکن ضروری نہیں ہے کہ ہر خواب، اللہ ہی کی طرف سے ہو۔ بعض خواب شیطان کی طرف سے بھی ہوتے ہیں اور بعض خواب انسان کی دن بھر کی سوچیں ہوتی ہیں جو نیند میں خواب کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ جب بھی کوئی خواب دیکھے تو پہلے اس بات کا تعین کرے کہ اس کا مصدر کیا ہے؟ دن بھر کے خیالات، شیطان کا وسوسہ یا اللہ عزوجل کی طرف سے الہام۔ اس کے بعد اس کی کوئی مناسب تعبیر کر لے۔

اگر کوئی خواب اللہ کی طرف سے ہو تو وہ مبشرات میں سے ہے اور اس نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ مبشرات کا معنی یہ ہے کہ اس خواب میں بندہ مومن کے لیے کوئی خوش خبری ہے جیسا کہ خواب میں اللہ کے رسول ﷺ کی زیارت کا نصیب ہونا۔ اور دوسرا یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اسے نبوت کا چھیالیسواں حصہ قرار دیا ہے کہ نبوت کے علم کا جو ماخذ (source) ہے، وہ اور اچھے خواب کا ماخذ ایک ہی ہے کہ بعض خواب ایسے ہوتے ہیں کہ جن میں انسان کو مستقبل کے کسی واقعے کی خبر خواب میں ہو جاتی ہے، تو یہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اگر وہ واقعہ خوشگوار ہے تو انسان اللہ کا شکر ادا کرے اور اگر ناگوار ہے تو اس سے اللہ کی پناہ مانگے اور صدقہ کرے تا کہ اس کی آزمائش ٹل جائے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«لَمْ يَبْقَ مِنَ النُّبُوَّةِ إِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ» قَالُوا: وَمَا الْمُبَشِّرَاتُ؟ قَالَ: «الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ»[2]

"نبوت میں سے کچھ باقی نہیں رہا سوائے مبشرات کے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ مبشرات کیا ہیں؟ تو

---

[1] سنن ابن ماجة، كِتَابُ تَعْبِيرِ الرُّؤْيَا، بَابُ الرُّؤْيَا ثَلَاثٌ: 3907، قال الألباني هذا الحديث صحيح

[2] صحيح البخاري، كِتَابُ التَّعْبِيرِ، بَابُ الْمُبَشِّرَاتِ: 6990

آپ ﷺ نے فرمایا: اچھے خواب۔"

مبشرات بھی کسی شخص کے صراط مستقیم پر ہونے کی نشانی ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ جنتی بھی ہے۔ اس کا مطلب صرف اتنا ہی ہے کہ جس وقت میں اسے یہ خواب آیا ہے، اس وقت میں وہ صراط مستقیم پر ہے یا اس کی جستجو میں ہے لہٰذا اس حال پر استقامت اختیار کرے۔

اب تو شر اس قدر پھیل گیا ہے کہ مرید اپنے سلسلے کی ایڈورٹائزمنٹ کے لیے اپنے پیر صاحب کے بارے نہ صرف خواب گھڑتے ہیں بلکہ کرامتیں بھی وضع کی جاتی ہیں۔ اللہ کے جنتی بندے تو وہ ہیں جو اپنے مبشرات کو چھپاتے ہیں اور لوگوں میں بیان کر کے جھوٹا مقام حاصل کرنے کی خواہش نہیں رکھتے بلکہ وہ تو اپنے مبشرات کو شبہ کی نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں کہ معلوم نہیں شیطان کی طرف سے نہ ہوں اور ہمیں شیطان نے کسی دھوکے میں ڈالنے کی کوشش نہ کی ہو۔

بعض لوگوں کو اللہ کے رسول ﷺ کی زیارت نصیب ہوتی ہے تو اس بارے آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ جس نے مجھے خواب میں دیکھا تو اس نے مجھے ہی دیکھا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«مَنْ رَآنِي فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَآنِي، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَتَمَثَّلُ بِي»[1]

"جس نے مجھے خواب میں دیکھا تو اس نے مجھے ہی خواب میں دیکھا کہ شیطان میری صورت اختیار نہیں کر سکتا ہے۔"

البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص نے اللہ کے رسول ﷺ کے بارے کوئی خواب نہ دیکھا ہو لیکن وہ لوگوں میں شہرت حاصل کرنے کے لیے یہ جھوٹ بولے کہ اسے اللہ کے رسول ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی ہے۔ لہٰذا ہمارے پاس تصدیق کا کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے کہ جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ کسی شخص کو واقعتاً خواب میں اللہ کے رسول ﷺ کی زیارت ہوئی ہے یا نہیں؟ مبشرات انسان کی اپنی ذات کی حد تک تو ایک خوش خبری ہو سکتے ہیں لیکن دوسروں نے جب کسی کے بارے رائے قائم کرنی ہے تو اس کا ایک ہی معیار ہے اور وہ اس کا ظاہر شریعت پر عمل پیرا ہونا ہے۔

اب اگر کسی شخص کو اللہ کے رسول ﷺ خواب میں آئیں اور اسے شک ہو جائے کہ یہ اللہ کے رسول ﷺ ہی تھے یا اسے کوئی وہم لاحق ہوا ہے تو اس بارے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر اللہ کے رسول ﷺ کے خواب میں نظر آنے پر خشوع کی کیفیات حاصل ہوں تو اس نے واقعتاً اللہ کے رسول ﷺ ہی کو خواب میں دیکھا ہے۔ مثال کے طور کسی صاحب نے اللہ کے رسول ﷺ کو خواب میں دیکھا تو ایک دو دن تک اس زیارت کے نتیجے میں ان پر مسلسل گریہ کی کیفیت طاری رہی کہ جس میں ہر وقت آنکھوں سے آنسو جاری رہتے تھے اور سینہ جیسے نور سے

[1] صحيح مسلم، كتاب الرُّؤْيَا بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ مَنْ رَآنِي فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَآنِي: 2266

بھر دیا گیا ہو۔

اس قسم کے مبشرات بعض اوقات کسی جماعت کے ساتھ وابستہ لوگوں کو بھی ہوتے ہیں۔ اگر تو کسی مذہبی جماعت کے کارکنان جھوٹے خوابوں کے بیان کے ذریعے اپنی جماعت کی ایڈورٹائزمنٹ نہیں چاہ رہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ عزوجل اپنے کمزور بندوں کے بارے یہ چاہتے ہیں کہ اس قسم کے جماعتی مبشرات کے نتیجے میں وہ کسی ایسی دینی جماعت کے ساتھ وابستہ ہو جائیں کہ جس میں خیر کا پہلو غالب ہو اور اس وابستگی کے نتیجے میں زمانے کے فتنوں سے بچ جائیں۔ ان مبشرات کا ہرگز یہ مقصد نہیں ہوتا کہ وہ اکیلی ہی ایسی جماعت ہے جو اللہ کی نظر میں پسندیدہ ہے۔ اس قسم کا خیال بھی اللہ کی پناہ کو واجب کر دیتا ہے۔ اور شیاطین کے اس قسم کے وسوسوں سے پناہ مانگنے کے بہترین نبوی الفاظ یہ ہیں کہ جن کے ساتھ صبح و شام تین مرتبہ اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے:

«أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ الله التَّامَّةِ، مِنْ غَضَبِهِ وَعِقَابِهِ، وَشَرِّ عِبَادِهِ، وَمِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِينِ وَأَنْ يَحْضُرُونِ»[1]

"میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں پورے ہو کر رہنے والے کلمات کے ساتھ، اس کے غضب اور عذاب سے، اس کے بدترین بندوں سے، اور شیاطین کے وسوسوں سے، اور اس بات سے کہ وہ شیاطین میرے پاس آئیں۔"

کرامت اور عقیدت

مجھے حضرت حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 1957ء) کا ایک واقعہ انہی کی زبانی پڑھ کر بڑی حیرانی ہوئی کہ ہم نے جو واقعہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی کرامت کے طور کئی بار سنا تھا کہ اُنہوں نے مالٹا کی اسیری کے زمانے میں رمضان شریف میں ایک ماہ میں قرآن مجید یاد کر لیا تھا، خود اُنہوں نے اپنی ایک تحریر میں اس واقعے کا انکار کیا ہوا تھا۔ اُن کی زندگی میں ہی اُن کی یہ کرامت اس قدر معروف ہو گئی تھی کہ اُنہیں اس کا انکار کرنا پڑا کہ ایسی ویسی کوئی کرامت مجھ میں نہیں ہے۔[2]

اسی طرح حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی جو کتابت مولانا دریابادی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 1977ء) سے ہوئی ہے تو اس میں مولانا دریابادی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے اصرار کیا کہ آپ صاحب کشف ہیں اور مجھے بتلا دیں کہ آپ صاحب کشف ہیں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں لکھا کہ لوگوں نے عام کر دیا، میں آپ کو سچ بتلا رہا ہوں کہ میں صاحب کشف نہیں ہوں، میں اس پر قسم کھانے کو بھی تیار ہوں لیکن آپ یقین نہیں کریں گے کیونکہ اس وقت آپ میرے بارے یہی سمجھنے کے موڈ میں ہیں۔

---

[1] المدني، مالك بن أنس، الموطأ، كتاب الشعر، باب مَا يُؤْمَرُ بِالتَّعَوُّذِ: 3499، قال الألباني هذا الحديث موضوع، مؤسسة زايد بن سلطان آل نهيان، الإمارات، الطبعة الأولى، 2004م

[2] عبدالقیوم حقانی، مولانا، سوانح شیخ الاسلام حسین احمد مدنی: ص45، القاسم اکیڈمی، نوشہرہ، 2005ء

دو بزرگ علماء کے یہ واقعات اس بات کی دلیل ہیں کہ کرامات کیسے وجود میں آتی ہیں؟ امر واقعہ یہ ہے کہ حکایات اولیاء کے نام سے جس قدر دیومالائی کرامات تصوف کی کتابوں میں نقل ہو گئی ہیں، انبیاء کے معجزات ان کے سامنے حقیر معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کرامات دراصل پیروں کی نہیں بلکہ مریدوں کی ہیں کہ انہوں نے اپنے پیر کی زندگی میں ہی اس کے نام سے وہ باتیں عام کر دیں کہ خود پیر صاحب بھی ان کا انکار کرنا چاہیں گے تو لوگ یقین نہ کریں گے۔

اس کا تعلق انسان کی نفسیات سے بھی ہے۔ انسان جس سے متاثر ہونا چاہتا ہے، اسے مافوق الفطرت انسان (superman) کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہے۔ مغرب کی فلم انڈسٹری بھی اسی انسانی کمزوری کی بنیاد پر سپر مین، اسپائیڈر مین، بیٹ مین، آئرن مین اور معلوم نہیں کیسے کیسے مافوق الفطرت کرداروں کے ذریعے بلین ڈالرز کا کاروبار کر رہی ہے۔ اولیاء اللہ کی مافوق الفطرت قسم کی کرامات اور حکایات بھی دراصل مذہبی کاروبار ہی ہے جو کسی صالح شخص کی وفات کے بعد اس کی ناخلف اولاد اس کا مزار بنا کر اور اس کی گدی سنبھال کر کرتی ہے۔ اور اب اس ناخلف جانشین اور خلیفہ مجاز میں وہ اخلاق اور کردار تو ہوتا نہیں کہ جس کی وجہ سے کوئی نذر اور نذرانے آئیں تو پھر اس گدی سے متعلق اکابر اولیاء کے بارے ایسی حکایات گھڑی جاتی ہیں کہ جن سے ان کے سپر مین ہونے کے یقین میں اضافہ ہو اور سلسلے کے مریدوں میں زیادہ سے زیادہ ہوں تاکہ گدی نشین پیر صاحب کا کاروبار خوب ترقی کرے۔

پاکستان کے بڑی بڑی گدی نشین کون سے ہیں؟ سارے سیاست دان ہیں۔ ایک طرف مذہب کے نام پر لوگوں کو بے وقوف بنا کر اپنے پیچھے لگایا ہوا ہے کہ ان کا مذہبی استحصال کر رہے ہیں۔ اور دوسری طرف سیاست کے راستے ان کی دنیا بھی اپنے قدموں میں ہے۔ شاہ محمود قریشی، مخدوم امین فہیم، یوسف رضا گیلانی اور پیر پگاڑا وغیرہ کون لوگ ہیں؟ ان کا دینداری سے کیا اور کتنا تعلق ہے؟ لیکن جن درباروں کے یہ گدی نشین ہیں، ان سے وابستہ مریدوں کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ یہی لوگ ہیں کہ عوام کی دنیا بھی خراب کر رہے ہیں اور ان کی آخرت بھی تباہ کر چکے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يَا لَيْتَنَا أَطَعْنَا اللَّهَ وَأَطَعْنَا الرَّسُولَا ۝ وَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا ۝ رَبَّنَا آتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيرًا ۝ ﴾[1]

"اور اہل جہنم کہیں گے: اے رب ہمارے، ہم نے اپنے پیشواؤں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں سیدھے راستے سے ہٹا دیا۔ اے ہمارے رب، ان کو دوہرا عذاب دے اور ان پر سخت لعنت کر۔"

[1] سورة الأحزاب: 33: 66-68

صوفیاء کی شطحیات

شطحیات (ecstatic utterance) سے مراد صوفیاء کی وہ گنجلک باتیں ہیں کہ جو ان سے بے خودی اور مدہوشی کے عالم میں صادر ہوں اور خود ان کی اپنی سمجھ سے بھی بالاتر ہوں۔ صوفیاء کی ان باتوں کا خود صوفیاء کے حلقوں میں اعتبار نہیں کیا جاتا اور ان باتوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مصدر شیطان ہوتا ہے یعنی یہ شیطان کی طرف سے صوفی کے دل میں اس وقت القا کی جاتی ہیں جبکہ اسے اپنے نفس پر قابو حاصل نہیں ہوتا اور وہ وجد اور سکر کی کیفیت میں ہوتا ہے۔ صوفیاء کی ایسی باتوں کی ہرگز تاویل نہیں کرنی چاہیے کہ ان کی تاویل کرنا بھی ایمان کے منافی ہے بلکہ ان باتوں پر شدید نکیر کرنی چاہیے کہ یہ نہی عن المنکر کا مقام ہے۔

شیخ ابن عربی (متوفی 1240ھ) نے اپنی کتاب "فصوص الحکم" میں "خاتم الاولیاء" کو "خاتم الانبیاء" سے افضل قرار دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ تمام انبیا اور رسول خاتم الاولیاء سے استفادہ کرتے ہیں۔ شیخ کی عبارت یوں ہے:

"وليس هذا العلم (أي علم التوحيد الوجودي) إلا لخاتم الرسل وخاتم الأولياء، وما يراه أحد من الأنبياء والرسل إلا من مشكاة الرسول الخاتم، ولا يراه أحد من الأولياء إلا من مشكاة الولي الخاتم، حتى أن الرسل لا يرونه – متى رأوه – إلا من مشكاة خاتم الأولياء."[1]

"توحید وجودی کا علم صرف خاتم الرسل اور خاتم الاولیاء کے پاس ہے۔ اور تمام انبیا اور رسول یہ علم خاتم الرسل کے سینے سے حاصل کرتے ہیں اور تمام ولی یہ علم خاتم الاولیاء کے سینے سے حاصل کرتے ہیں۔ بلکہ رسول بھی جب اس توحید کا مشاہدہ کرتے ہیں تو خاتم الاولیاء کے سینے سے کرتے ہیں۔"

خاتم الاولیاء سے ابن عربی کی کیا مراد ہے۔ تو اس بارے ابن عربی کا ذہن تو واضح ہے کہ ان کی اس سے مراد وہ خود ہیں۔ وہ اپنی کتاب "فتوحات مکیہ" میں لکھتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میں ہی خاتم الاولیاء ہوں۔[2]

البتہ ان کے شارحین نے یہ کہا ہے کہ اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ نبی کی ولایت کی جہت، نبی کی رسالت کی جہت سے افضل ہے۔ اگرچہ یہ شیخ ابن عربی کی بات نہیں ہے، لیکن ایک مزعومہ علمی نکتے کے طور اس بات کا بھی تجزیہ کریں تو انتہائی سطحی بات معلوم ہوتی ہے۔ نبی اپنی ولایت کی جہت میں بھی رسول ہی ہوتا ہے۔ رسول کی زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں ہوتا کہ جس میں اس کی رسالت منقطع ہو جائے یا وہ مانند پڑ جائے یا وہ دیگر جہات سے مغلوب ہو جائے۔

---

[1] ابن عربي، محي الدين محمد بن علي الأندلسي، فصوص الحكم، دار الكتاب العربي، بيروت، ص 62

[2] أنا ختم الولاية دون شك لورثي الهاشمي مع المسيح [ابن عربي، محي الدين محمد بن علي الأندلسي، الفتوحات المكية: 4/ 71]، الهيئة المصرية العامة، مصر، 1975ء

رسول کی زندگی میں ہر لمحہ رسالت کی جہت، ان کی دیگر تمام جہات پر غالب رہتی ہے، چاہے وہ بشریت کی جہت ہو یا ولایت کی یا کوئی اور۔ رسول جب مصلے پر کھڑا ہو کر خالق کی طرف یکسو ہوتے ہوئے تقرب الی اللہ کی منازل طے کر رہا ہو تو اس وقت بھی رسول ہوتا ہے اور جب وہ بازاروں میں لوگوں کو اللہ سے قریب کرنے کے لیے مخلوق کی طرف متوجہ ہو تو وہ اس وقت بھی رسول ہوتا ہے۔

رسول کی ولایت کا اس کی رسالت سے کیا تقابل؟ رسول کو یہ مقام اور مرتبہ رسالت کی وجہ سے ملا ہے نہ کہ ولایت کے سبب سے۔ اللہ عزوجل نے رسول ﷺ کو "یأیها الرسول" اور "یأیها النبي" کہہ کر قرآن مجید میں خطاب فرمایا ہے نہ کہ "یأیها الولي"۔

صوفی اور سلفی

اکثر صوفیوں کو دیکھا ہے کہ بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں، مثلاً ایک پیر طریقت مدظلہ تعالی نے سلفیوں کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہم نے ہزاروں متقی اور پرہیز گار پیدا کیے تم نے کیا پیدا کیا ہے؟

اللہ معاف فرمائے! یہ اِس زعم کے ساتھ بات کرتے ہیں جیسے اللہ سے متقی اور صالح ہونے کا سرٹیفکیٹ جیب میں لیے بیٹھے ہوں۔ بھئی! ان معاملات میں اللہ سے ڈرنا چاہیے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی کا مطالعہ کریں تو وہ ایسے سپرمین نہیں تھے جیسے اولیاء اللہ کی حکایات میں دکھائے جاتے ہیں، وہ عام انسانوں جیسے معلوم ہوتے ہیں کہ جو تقوی اور اصلاح کا شوق رکھنے والے تھے۔

متقی کون ہے؟ کل حشر میں کس کا کیا مقام ہے؟ صوفی آگے ہو گا یا سلفی؟ تصوف کی تائید کرنے والے اللہ کے مقربین میں سے ہوں گے یا اس کی مخالفت کرنے والے۔ یہ اللہ بہتر جانتا ہے، اس بارے اس دنیا میں یقین سے بات کرنا مشکل ہے۔ بلکہ قیامت والے دن تو بڑے بڑے برج الٹ جائیں گے۔

تصوف پر نقد کرنے والے سلفی علماء بھی ایسے ہو سکتے ہیں کہ مجلس میں نقد کرنے کے بعد تنہائی میں اپنی نقد پر رونے والے ہوں اور اللہ سے اس بارے آہ وزاری کرنے والے ہوں کہ پروردگار! ہمیں کیا معلوم کہ جن پر ہم نقد کر رہے ہیں، وہ قیامت والے دن ہم سے زیادہ مقرب ہوں لیکن ہمیں تو بس جو منکر معلوم ہوتا ہے، ہم اس پر تنبیہ کرتے ہیں اور رد کرتے ہیں۔

صوفیوں کو اپنی نیکی اور تقوی کا زعم ہو سو ہو کہ یہ ان کا خاص میدان ہے لیکن کم از کم غیر صوفیوں کو تقوی اور نیکی میں حقیر تو نہ سمجھیں۔ حال ہی کے سلفیوں میں بھی ایسے علماء موجود ہیں کہ جن کی ساٹھ سال سے تہجد قضا نہیں ہوئی۔ وہ سلفی اہل علم بھی ہیں کہ جن سے پوچھا گیا کہ اللہ کے رسول ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی ہے؟ تو انہوں نے جواب میں کہا کہ جس ہفتہ زیارت نہ ہو تو دل مضطرب اور بے چین ہو جاتا ہے۔ ان میں سے وہ سلفی اہل علم بھی ہیں کہ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تھے تو پورے وجود پر لرزہ طاری ہو جاتا۔ اور وہ بھی سلفی اہل

علم ہی تھے کہ جن کی نماز دیکھنے کے لیے خلق خدا سفر کرتی تھی۔ اور وہ بھی سلفی اہل علم میں سے ہیں کہ جنہوں نے مسجد کے صحن میں نماز کی نیت باندھی اور طوفانی بارش کی وجہ سے سوائے دو مقتدیوں کے سارے بھاگ گئے اور انہوں نے سلام پھیرنے کے بعد پہلا جملہ کہا کہ بارش ہوئی ہے اور عبد اللہ کو پتہ بھی نہیں چلا۔ اگر صوفیاء میں غوث، قطب اور ابدال موجود ہیں تو سلفیوں میں بھی بہت سے لوگ ہیں کہ جنہیں قرآن مجید اور حدیث کی اصطلاح میں "عباد الرحمن" اور "اہل القرآن" کہا جاسکتا ہے۔

صوفیاء کو دنیا میں شیخ اکبر کے رتبے پر فخر کرنے سے کیا حاصل کہ قیامت کے دن اگر ایک مخلص سلفی ان سے آگے کھڑا ہو۔ اور اس کے برعکس سلفیوں کو شیخ الاسلام کے مقام پر اترانے کا کیا فائدہ کہ اگر کوئی مخلص زاہد قیامت والے دن ان سے آگے ہو۔ ہماری رائے میں صوفیوں اور سلفیوں میں نظریات پر بحث ہونی چاہیے کہ کیا درست ہے اور کیا غلط ہے؟ باقی رہے یہ دعوے کہ ہم نے تو تزکیہ کر لیا ہے، اور تم نے کیا کیا ہے؟ اور اپنے بارے سارے مبشرات اور دوسروں کے بارے ساری وعیدیں جمع کر لی ہیں، تو یہ درست نہیں ہے۔ امید واثق تو یہی ہے کہ قیامت والے بہتے سادہ لوح، ان پڑھ، دیہاتی مرید کہ جنہیں کوئی نہیں جانتا تھا، پیر طریقت، قطب عالم اور خاتم الاولیاء سے زیادہ مقربین کی فہرست میں ہوں گے۔

قرآن مجید نے تزکیہ نفس کا حکم دیا ہے اور اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تزکیہ فرمایا ہے لیکن معلوم نہیں لوگوں نے تزکیہ کو کیا پہاڑ سمجھ رکھا ہے کہ جب تک بندہ ہوا میں اڑنا نہ شروع کر دے، اس وقت تک اس کا تزکیہ مشکوک رہتا ہے۔ بھئی! اگر آپ فرائض پر عمل پیرا ہیں، حرام سے بچتے ہیں، نوافل کا اہتمام کرتے ہیں، اخلاق حسنہ سے متصف ہونے اور رذائل سے اجتناب کی کوشش کرتے ہیں تو اور آپ کو کیسا تزکیہ چاہیے؟ تزکیہ کا مقصود احسان کی کیفیات کے ساتھ کتاب وسنت پر عمل کرنا ہے۔ کسی کی احسان کی کیفیات ماپنے کے معیارات کیا بیعت، سماع، مراقبہ، لطائف اور وجد کی کیفیات ہیں یا فرائض اور نوافل پر عمل اور حرام ومکروہ سے اجتناب کرنے سے پیدا ہونے والے احوال؟

تصوف اور ادب

شاعروں اور ادیبوں نے جس نظر سے تصوف کو دیکھا ہے، وہ بہت ہی سطحی نظر ہے۔ ابھی ہم شعرا کی بات نہیں کر رہے بلکہ قدرت اللہ شہاب (متوفیٰ 1986ء)، اشفاق احمد (متوفیٰ 2004ء) اور ممتاز مفتی (متوفیٰ 1995ء) وغیرہ کی بات کرتے ہیں۔ اب اس سے پہلے کہ کوئی صوفی مجھ سے یہ لغو سوال کرے کہ ان کو پڑھا بھی ہے یا ایسے ہی تبصرہ کر رہے ہو، تو بتاتا چلوں کہ "شہاب نامہ"، "من چلے کا سودا" اور "لبیک" وغیرہ جیسی کتابیں سب پڑھی ہیں۔

قدرت اللہ شہاب (متوفیٰ 1986ء)، اشفاق احمد (متوفیٰ 2004ء) اور ممتاز مفتی تینوں دین کو تصوف کا

مترادف قرار دیتے ہیں اور تصوف ان کے نزدیک کچھ مابعد الطبیعاتی (metaphysical) امور کے وقوع کا نام ہے۔ پس دین کا جو تصور انہوں نے اپنے ڈراموں، سوانح اور سفر ناموں سے عام کرنے کی کوشش کی ہے، وہ کراماتی اور راہبانہ تصور دین ہے۔ "شہاب نامہ" اور "لبیک" کو دیکھ لیں کہ سوانح اور سفر نامے سے زیادہ کرامات کی کتاب معلوم ہوتی ہے۔ اور سلوک کے مقامات طے کرنے کا فیصلہ گویا کہ کرامات سے ہو رہا ہے۔

اور اشفاق احمد نے تو "من چلے کا سودا" کا آغاز ہی اس بات سے کیا ہے کہ والدین، چودہ سال بعد اپنے بیٹے سے ملنے سے اس لیے انکار کر دیتے ہیں کہ جو چیز اللہ کی راہ میں ایک بار دے دی تو اب ہمارا اس سے کیا تعلق۔ یہ وہی رویہ ہے کہ جس کا ذکر مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے کیا ہے کہ جب انہیں ان کے بچے کی وفات کی خبر ملی تو کہا کہ سگ بچہ مر گیا ہے۔

دوسری طرف علماء کے حلقے میں تصوف کے میدان کے جو معتدل لوگ ہیں، وہ کرامات کو کچھ حیثیت نہیں دیتے جیسا کہ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو پڑھ لیں۔ بلکہ بعض صوفیاء نے تو لکھا ہے کہ کرامت اور مافوق الفطرت امور تو صوفی کا حیض ہیں لیکن بد قسمتی سے لوگوں کی ساری دلچسپی تصوف کے نام پر ایسی ہی چیزوں میں ہے۔ اور صوفی ادیبوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا کچھ فائدہ بھی ہوا ہے مثلاً یہ کہ جاوید چوہدری جیسے لوگ دین سے جڑے رہتے ہیں لیکن نقصان زیادہ ہوا ہے ہر شخص "بندہ" کی بجائے "بابا" بننے کے چکر میں ہے۔ ہمارے دین کا خلاصہ بندہ بنانا ہے نہ کہ بابا۔ کیا یہ المیہ کم ہے کہ ہمارے ہاں اللہ سے تعلق کی گہرائی اس پوزیشن سے طے ہو رہی ہے کہ ہم نے بلندی کی کتنی منازل طے کر لی ہیں؟ اسی فکر میں لگے ہیں کہ قطب کے درجے پر پہنچنا ہے یا غوث بننا ہے۔ ساتویں آسمان تک پہنچ چکے اور عرش پر پہنچنا ہے۔ ہم اللہ عزوجل سے بندگی کے تعلق کو بھی اپنی بلندیوں کے معیارات سے پرکھنے سے باز نہیں آئے۔

ان ادیبوں کے ساتھ ہونے والے واقعات کی حقیقت یہ ہے کہ یہ ایسے واقعات ہیں جو ہم میں سے ہر کسی کو پیش آتے ہیں۔ لیکن چونکہ ہم آپ میں وہ قوت تخلیق نہیں ہے کہ اپنی زندگی کے واقعات کو افسانوی رنگ دے کر "بابا" کہلوا سکیں لہذا آپ اس روحانی مقام پر فائز ہونے سے اس وجہ سے محروم رہتے ہیں۔ بھائی! مجھے بھی بہت الہام ہوتے ہیں، میرے ساتھ بھی بہت مابعد الطبیعی واقعات پیش آتے ہیں، مجھے بھی بہت سی روحانی واردات حاصل ہیں، میں ذرا سا اپنا سر جھکا لوں تو اپنا قلب جاری کر سکتا ہوں وغیرہ وغیرہ لیکن مجھے شہاب نامہ لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ معمول کی چیزیں ہیں، ہر شخص کو پیش آتی ہے۔ انہیں ادب بنانے کی ضرورت نہیں ہے، بے کار کا کام ہے بلکہ ادب کے نام پر بے ادبی ہے۔

مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ صوفیاء کے بعض حلقے ان ادیبوں کے تصوف سے نالاں ہیں، اس کی وجہ نفسانی ہے کہ انہوں نے ان کا کاروبار خراب کر دیا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ پڑھے لکھے لوگ اپنے اندر کے روحانی خلا کو پر کرنے کے لیے ایسے ادیبوں ہی کا رخ کریں گے کہ جس سے روایتی تصوف کے پیروں کی دکان متاثر ہو گی کہ ان کے مرید

کم ہوں گے، لیکن ہماری تنقید تو دونوں طبقوں پر ہے۔ ہمارے نزدیک یہ دونوں طبقے دین کے اصل تصورِ اصلاح نفس کو پیش نہیں کر رہے۔

بھئی! اپنے تزکیے پر جتنا مرضی زور لگالو، رہو گے تو انسان کے انسان ہی۔ بس اگر اسی ایک جملے میں ہی غور کر لو تو مروجہ تصوف اور اس کی حقیقت جان جاؤ گے۔

اسلام اور پیری مریدی

اسلام میں جس پیری مریدی کی گنجائش ہے، وہ یہ ہے کہ پیر، مرید کی اصلاح کرے اور مرید، پیر کی اصلاح کرے۔ پیر، مرید کی بیعت کرے اور مرید، پیر کی بیعت کرے۔ پیر، مرید بھی ہو اور مرید، پیر بھی ہو۔ مرید، مرید بھی ہو اور پیر بھی، اور پیر، پیر بھی ہو اور مرید بھی۔ ایک طرف وحدت الوجود پر ایمان اور دوسری طرف پیر اور مرید کے فرق پر اصرار چہ معنی دارد۔

یہی سورۃ العصر کا خلاصہ ہے کہ اہل ایمان ایک دوسرے کی اصلاح کریں گے۔ یہاں کوئی معصوم نہیں ہے، سب غیر معصوم ہیں۔ معصوم صرف نبی اور رسول کی ذات تھی۔ لہذا اب ایک غیر معصوم دوسرے کی اور دوسرا پہلے کی اصلاح کرے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ الْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ ﴾[1]

"قسم ہے زمانے کی کہ تمام انسان خسارے اور نقصان میں ہیں مگر وہ لوگ دنیا اور آخرت کے نقصان سے امن میں ہیں جو ایمان لائے، انہوں نے نیک اعمال کیے، ایک دوسرے کو حق بات کی وصیت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی۔"

اور اسی سورۃ العصر کے بارے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اگر قرآن مجید میں اس کے علاوہ کچھ نازل نہ بھی ہوتا تو انسانوں کی ہدایت کے لیے یہ اکیلی سورت ہی کافی تھی۔[2] پس تزکیہ نفس ہو یا اصلاح احوال، یہ دو طرفہ معاملہ ہے، اصلاح کا یک طرفہ تعلق تو صرف نبی اور رسول کی ذات سے ہوتا ہے۔ البتہ یہ بھی نہ کرے کہ پیر ہی کی اصلاح کرتا رہے، کبھی کبھی اپنی بھی اصلاح کروالے۔

---

[1] سورۃ العصر: 103: 1-3

[2] تفسیر ابن کثیر: 1/ 203